قومی زبان

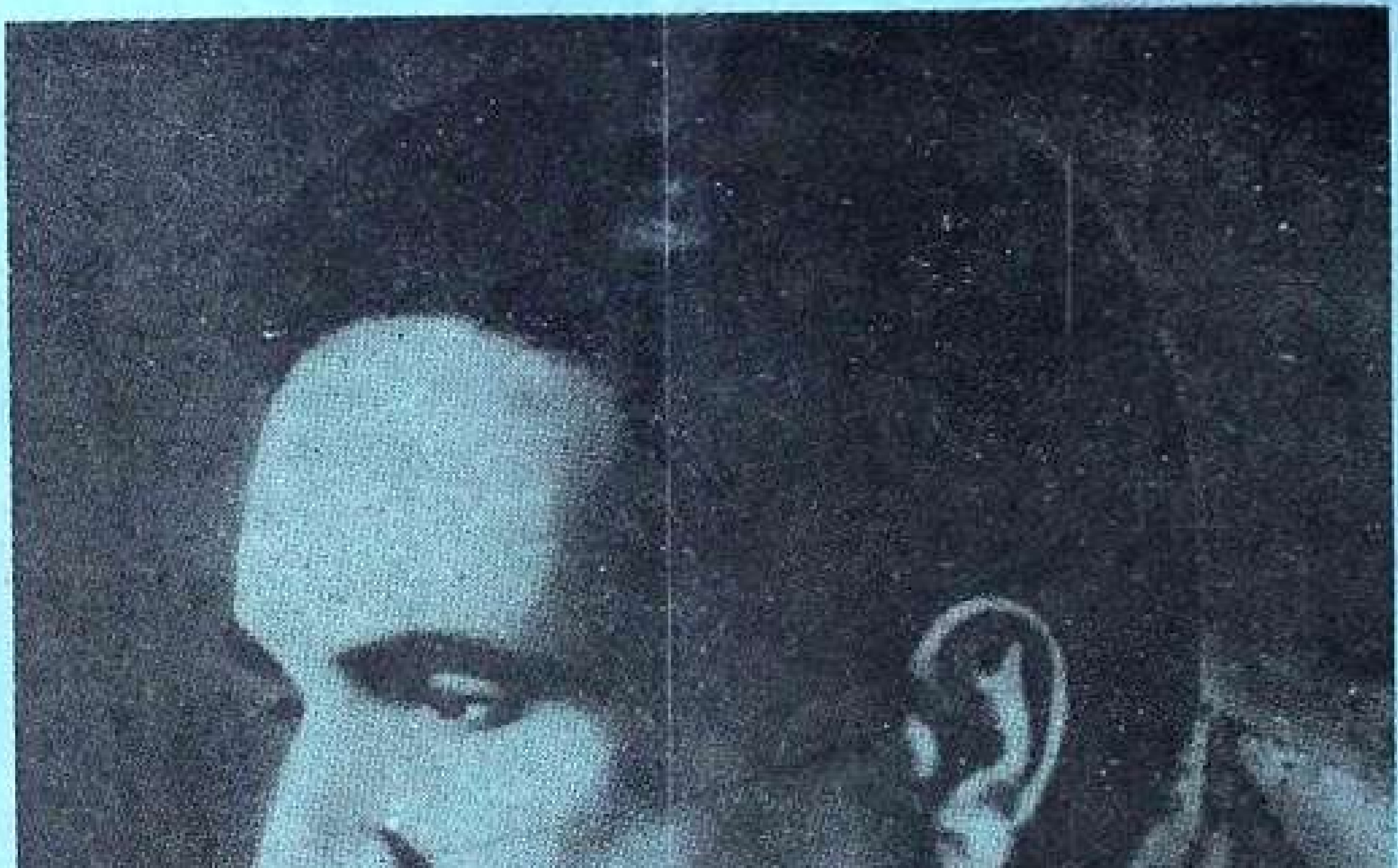

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ ۔ کراچی ۔ نمبر (۱)

ماہنامہ
قومی زبان
کراچی

نومبر ۱۹۸۶ء
جلد ۵۷
شمارہ ۱۱

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی
ادا جعفری
ڈاکٹر اسلم فرخی

مدیر معاون
ادیب سہیل

قیمت خصوصی شمارہ ۱۰ روپے

بدل اشتراک
فی پرچہ .... ۵ روپے
سالانہ .... ۵۰ روپے
سالانہ (رجسٹری سے) ...... ۱۰۰ روپے

بیرونِ ملک
فی پرچہ .... ۱۰ روپے
سالانہ .... ۱۵۰ روپے
سالانہ (رجسٹری سے) ...... ۱۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱ فون: ۷۲۴۰۲۲۳

مضمون نما

ادارِیہ ۳
نوادرِ کتب خانہ .... ڈاکٹر اسلم فرخی ۵
اقبال اور جہانِ امروز .... ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی ۹
شاعرِ مشرق کے حضور .... خاطر غزنوی ۱۴
اقبال اور تحریکِ پاکستان .... پروفیسر میاں محمد صادق ۱۵
شام شہر یاراں .... رضیہ فصیح احمد ۲۱
غزل نما ہاشمی بیجاپوری .... ادا جعفری ۲۵
مشرقی لٹریچر مغرب کیوں کر پہنچا .... فیض احمد ۲۹
منشی کیولا پرشاد فقر .... رضوان اللہ ۳۵
لفظ "کر" کی حقیقت .... ڈاکٹر سہیل بخاری ۴۲
شاعری اور فکشن .... ڈاکٹر فہیم اعظمی ۴۵
غلام عباس کا اسلوب .... ممتاز احمد خاں ۴۸
پیش رفتہ برصغیر کے قلمی اور نادر ذخیرے ۵۳
گلہائے رنگ رنگ دو بیٹے .... برتولت بریخت / آصف فرخی ۵۹
نظمیں .... ترجمہ: مشتاق شاد ۶۲-۶۳
وہ شام .... موہن کلپنا / رفیق احمد نقش ۶۵
گوشۂ طلبہ
جغرافیہ کا اخلاقی پہلو .... پروفیسر رباب رضوی ۶۹
برطانیہ کا سیاسی نظام .... ریحانہ مغنی ۷۱
رفتارِ ادب ۷۵
گرد و پیش ۸۰
ردِ عمل ۸۵
حزفِ تازہ ۸۷
نئے خزانے ۹۱

نومبر کا مہینہ شاعرِ مشرق کا مہینہ ہے۔ نومبر سے شاعرِ مشرق کی لازوال ادبی، ملّی اور سیاسی خدمات کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ "قومی زبان" علامہ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے میں پیش پیش ہے اور اس امر کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہے کہ علامہ نے اپنی روح پرور شاعری سے قومی زبان کو ایک نیا اسلوب اور طرزِ فکر عطا کیا جس سے ادب و زبان میں بے شمار نئے امکانات اُبھر آئے۔

---

۲۲ نومبر ۱۹۸۶ء کو لاہور میں ملک کے ممتاز ادیب، شاعر اور افسانہ نگار جناب احمد ندیم قاسمی کی سترّویں سالگرہ کا جشن منایا گیا۔ جشنِ ندیم میں ملک کے گوشے گوشے سے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی، ادباء و شعراء کے علاوہ مقامی و غیر مقامی انجمنوں اور اداروں کی طرف سے تحائف بھی پیش کیے گئے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کی نمائندگی انجمن کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی نے فرمائی، اور انجمن کی طرف سے نشانِ سپاس بھی پیش کیا۔

کسی ادیب کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں جشن منعقد کرنا مستحسن اور خوش آئند روایت ہے۔ ایک تخلیق کار کے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی زندگی میں اس کی ادبی خدمات کو سراہا جائے۔ اس موقع پر ہم بھی دعاگو ہیں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس

نوادرِ کتب خانۂ خاص

مختارِ اشعار

ڈاکٹر اسلم فرخی

عماد الملک سیّد حسن بلگرامی کا شمار برصغیر کے معروف علمی اور ادبی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ عماد الملک دنیاوی اعتبار سے بڑے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے لیکن چونکہ بنیادی طور پر وہ علمی اور ادبی انسان تھے لہٰذا علم و ادب سے ان کا تعلق ہمیشہ برقرار رہا۔ انھوں نے خود بھی تصنیف و تالیف کا کام کیا اور بے شمار مصنّفوں کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ ان کے لیے مالی امداد و اعانت فراہم کی۔ علمی اداروں کی سرپرستی کی۔ انجمن ترقیِ اردو کے ایک مدّت تک صدر رہے۔ انجمن کو ان کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچا۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے عماد الملک کے بارے میں ایک بڑا تفصیلی مضمون لکھا ہے جس سے عماد الملک کی علم دوستی، شرافت اور بزرگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولوی صاحب نے عماد الملک کی تصانیف کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ لیکن ان تصانیف سے قطع نظر عماد الملک کا ایک ادبی کارنامہ ایسا ہے جو بظاہر غیر معروف ہے لیکن اس کی تاریخی اہمیت اور ادبی حیثیت آج بھی مسلّم ہے۔

عماد الملک کا یہ ادبی کارنامہ اُردو کے اکابر شعرا کا انتخاب ہے جو مختارِ اشعار کے نام سے شائع ہوا۔ کتب خانۂ خاص میں اس انتخاب کے دس حصّے موجود ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱)	میر شیر علی افسوسؔ	صفحات	۲۷	مطبع مفیدِ عام آگرہ	۱۸۹۶ء
(۲)	عبد الحئی تاباںؔ	"	۲۷	" " "	"
(۳)	نظام الدین ممنون	"	۴۳	" " "	"
(۴)	نظیر اکبرآبادی	"	۲۲	" " "	"
(۵)	مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ لکھنوی	"	۲۶	" " "	
(۶)	شیخ قلندر بخش جرأت	"	۹۰	" " "	۱۸۹۷ء
(۷)	مرزا محمد رفیع سوداؔ	"	۷۶	ندارد	
(۸)	شاہ نصیرؔ	"	۲۴	(بار دوم) مطبع کرسیٹین نالج سوسائٹی مدراس	۱۹۰۱ء
(۹)	قیام الدین قائمؔ چاندپوری	"	۶۸	" "	۱۹۰۳ء
(۱۰)	میر تقی میرؔ	"	۱۰۹	مطبع نور الاسلام حیدرآباد دکن، ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء	

انتخاب میر کے علاوہ باقی تمام انتخابات پر یہ عبارت ملتی ہے "جیسے عالی جناب نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی نے منتخب کیا اور مدراس اسکول بکز اینڈ لٹریچر سوسائٹی نے مشتہر کیا"۔ انتخاب میر پر جو عبارت ہے وہ یہ ہے۔ "جس کو عالی جناب نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی سی۔ ایس۔ آئی رکن مجلسِ وزیر ہند دام اقبالہ نے انتخاب فرمایا اور ان کی اجازت سے اس خاکسار ذرہ بے مقدار علی حیدر طباطبائی نے مطبع انوار الاسلام میں چھپوا کر شائع کیا۔ صفر ۱۳۲۳ھ"

یہ عبارتیں بعض باتوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ یہ انتخابات درسی ضروریات کے تحت کیے گئے تھے۔ مدراس اسکول بکز اینڈ لٹریچر سوسائٹی کا انھیں مشتہر کرنا شاہد ہے کہ ان کا تعلق درسیات سے تھا اور بہت ممکن ہے کہ یہ انتخابات مدراس یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہوں۔ علی حیدر طباطبائی کے اہتمام سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی علی حیدر طباطبائی المتخلص بہ نظم کا بھی ان انتخابات سے تعلق تھا۔ انتخابات کے مجموعی عنوان "مختارِ اشعار" سے اس تعلق خاطر کی وضاحت ہوتی ہے جو عماد الملک کو مختار الملک سر سالار جنگ اوّل سے تھا۔ عماد الملک سر سالار جنگ کے متوسلین میں تھے۔ بلکہ عماد الملک کے حیدر آباد جانے کے بانی مبانی وہی تھے۔ عماد الملک ان کے پرائیوٹ سکریٹری بھی رہے تھے۔ اور وہ عماد الملک کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ اظہارِ ممنونیت کا یہ ایک بڑا روشن پہلو ہے کہ عماد الملک نے ان انتخابات کو مختار اشعار کا نام دیا۔

مختار اشعار کے بعض انتخابات کی اشاعت ایک سے زیادہ مرتبہ ہوئی۔ افسوس، تاباں، ممنون، نظیر اور ہوس کے انتخابات ایک جلد میں یکجا ۱۹۰۸ء میں بھی شائع ہوئے۔ یہ اشاعت مدراس کے مطبع ایس۔ پی۔ سی کے سے ٹائپ میں ہوئی۔ شاہ نصیر اور قائم کے انتخابات بھی ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۳ء میں مدراس سے ٹائپ میں شائع ہوئے جو کتب خانۂ خاص میں موجود ہیں۔ ممکن ہے اور انتخابات بھی دوبارہ شائع ہوئے ہوں مگر ان کے نسخے موجود نہیں ہیں۔

مختار اشعار سے عماد الملک کی سخن فہمی، اعلیٰ ذوق، ادبی معلومات، شعری روایات سے محرمانہ شناسائی اور زبان و محاورہ پر گہری نظر کا احساس ہوتا ہے۔ اگرچہ انتخابات میں دیباچے نہیں لکھے گئے تاہم عماد الملک نے بعض انتخابات میں کہیں کہیں حاشیہ لکھا ہے جس سے ان کے ذوقِ سخن کا اندازہ ہوتا ہے۔ میر کے اس شعر پر ؎

عشق ان کی عقل کو ہے جو ما سوا ہمارے ناچیز جانتے ہیں نابود جانتے ہیں

یہ نوٹ ملتا ہے "عشق بمعنی سلام ہے"

ایک اور شعر پر ؎

یاں میر ہم تو پہونچ گئے مرگ کے قریب واں دلبروں کو ہے وہی قصدِ جفا ہنوز

یہ حاشیہ ہے۔ "پہنچ کا بسکون باندھنا اب متروک ہے"

اس مصرعے "میں جوں نسیم بادِ فروشِ چمن نہیں" کی ترکیب "باد فروش" کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ "باد فروش بھاٹ کو کہتے ہیں"

میر کی مشہور غزل "کیا موافق ہو دوا عشق کے بیمار کے ساتھ" سے چھ اشعار منتخب کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ "اکثر اشعار میں ساتھ محاورہ حال کے خلاف ہے"۔

انتخاب قائم میں بھی اسی قسم کی توضیحات ملتی ہیں۔ کہیں تشریح ہے اور کہیں زبان و محاورہ کی قدامت کی طرف اشارہ ہے۔ انتخابات

صرف غزلیات پر مشتمل نہیں بلکہ رباعیات، خمسے اور دوسری اصناف کو بھی شامل کیا گیا ہے تاکہ شاعر کی ہمہ جہتی کا اندازہ ہو سکے۔

مختارِ اشعار کتنے شعرا کے انتخابات پر مشتمل ہے اب اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ کتب خانۂ خاص میں دس حصّے ہیں۔ چار حصّے (افسوس۔ نظیر۔ ممنون۔ ہوس۔ نیز ۱۹۰۷ء والا مدراسی نسخہ) ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن کے کتب خانے میں ہیں۔ ممکن ہے بعض اور کتب خانوں میں بھی اس کے نسخے موجود ہوں۔ یہ ایک اچھا ادبی کام تھا ایک صاحبِ ذوق، نکتہ رس، سخن سنج کی انتخابی صلاحیت کا مظہر جسے آج بھی کمیاب اور غیر معروف ہونے کے باوجود مستند ادبی حیثیت حاصل ہے۔

شان الحق حقّی کا ایک نادر شعری کارنامہ

قہرِ عشق

شیکسپیئر کے شہرہ آفاق ڈرامے انطنی کلوبطرہ کا منظوم و مقفیٰ ترجمہ
صفحہ بہ صفحہ اصل انگریزی متن کے ساتھ

یہ شیکسپیئر کے سب سے طویل رومانی ڈرامے کا اردو روپ ہے جس میں سیاست سے لے کر محبت تک، اور برّی و بحری جنگوں سے لے کر عشرت گاہوں کی رنگینیوں تک دل چسپ اور مسحور کن واقعات و سانحات کی ایک دنیا سمائی ہوئی ہے۔ کلوبطرہ کا منفرد کردار اور اس کے مختلف روپ کہ وہ عورت بھی ہے ملکہ بھی، سیاست میں الجھی ہوئی اور دام محبت میں بھی گرفتار۔ اُس کی طنّازی، طرّاری، چہلیں، رنگ رلیاں، خواصوں اور شاگرد پیشہ کی آپس کی چھیڑ چھاڑ، اور پھر اس تمام افسانے کا حسرتناک انجام جو ملکہ کی خودکشی پر ہوا۔ کلوبطرہ کے آخری لمحات کی دل گداز تصویر، غرض ایک بے مثل ادبی کارنامہ ہے، زبان و بیان کی خوبیوں سے مالا مال۔ کہیں زور خطابت ہے تو کہیں روزمرّہ کا لطف اور کسی ایک سطر پر بھی ترجمے کا گمان نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر میاں بشیر احمد مرحوم نے بھرے جلسے میں کہا تھا کہ معلوم ہوتا ہے اصل یہ ہے اور ترجمہ شیکسپیئر نے کیا تھا۔ حقّی صاحب کے بقول یہ اردو اسالیب کی ایک آزمائش تھی۔ اُردو اس میں کس طرح پوری اتری ہر پڑھنے [illegible] کی گواہی۔

انجمن ترقی اردو بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

اقبال — اور جہانِ امروز

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی

یہ درست ہے کہ ہر تخلیقی مصنّف کا خطاب ابتدائی طور پر اپنے دور، اپنے ملک اور پوری قوم ہی سے ہوتا ہے لیکن عظیم مصنّف صرف اپنے دور، اپنے ملک اور اپنی قوم تک اپنے آپ کو محدود نہیں کر لیتے بلکہ ان کے پیشِ نظر قارئین کا وسیع تر دائرہ ہوتا ہے۔ ان کے پیشِ نظر درحقیقت ساری نوعِ انسانی ہوتی ہے۔ وہ اپنی قوم کے ذہن سے آگے بڑھ کر ذہنِ انسان تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ علّامہ اقبال کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے ہی عظیم مصنّفین میں شامل ہیں۔ ان کے فن کارانہ اظہار کے قوی ترین تخلیقی محرکات پر توجہ دیجیے تو ظاہر ہوگا کہ یہ محرکات حسب ذیل ہیں۔ انسانی ارتقا کے بے پایاں امکانات پر ان کا یقینِ کامل، کائنات میں انسان کی ممتاز و منفرد حیثیت کے بارے میں ان کا نظریہ، انسان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی ایک باطنی غایت کا تصور یعنی بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کا خود اپنے آپ کو انسان کے پردے میں بروئے کار لانے کا تصوّر۔ گویا آخری تجربے میں علّامہ اقبال کی سب سے زبردست فکرمندی انسان کے مستقبل اور نوعِ انسانی کے بحیثیت مجموعی اخلاقی ترفع کے بارے میں نکلے گی نہ کہ کسی خاص دور، ملک یا قوم کے بارے میں۔ ان کے دل میں بنی نوعِ انسان کے لیے ویسے ہی محبّت و شفقت اور فکرمندی کے جذبات و احساسات ہیں جیسے کسی شفیق باپ کے دل میں اپنی اولاد کے لیے ہوتے ہیں۔ علّامہ اقبال کے فن کا سرچشمہ ان کے قلب و روح کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہے۔ اس کے پیچھے ایک پرجوش اخلاقی ولولہ ہے۔ ایک شدید خواہش نوعِ انسانی کے ذہن پر ان عظیم صداقتوں کا نقش ثبت کرنے کی جو انسان کی ترقی اور اس کی اخلاقی و روحانی حیاتِ نو کا باعث بن سکتے ہیں۔ وہ زندگی و قوت کے شاعر ہیں، حرکت و ترقی کے شاعر ہیں، کوشش و کامرانی کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری انسان کو آگے، اور آگے، اور آگے بڑھتے رہنے کی ترغیب دیتی ہے۔ ایک ایسے نصب العین کی طرف جو کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ جیسے ہی وہ حاصل ہوتا ہے ایک اور بلند تر نصب العین سامنے آ جاتا ہے اور اس طرح یہ مرحلۂ شوق کبھی طے نہیں ہوتا۔

علّامہ اقبال انسان اور دنیا کی موجودہ حالت سے سخت ناآسودہ ہیں۔ اور جو صورتِ حال ان کے زمانے میں موجود تھی وہ اب بھی موجود ہے، بلکہ اور خراب ہو گئی ہے۔ علّامہ چاہتے ہیں کہ اس صورتِ حال کو بدل دیا جائے بلکہ منقلب کر دیا جائے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں وہ تساہل و تن آسانی، تنزل و پستیِ فکری کا دور دورہ دیکھتے ہیں، ایسی دنیا میں جو مایوسی و تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے۔

وہاں ان کی شاعری حرکت وعمل، نشوونمائے ذات، اثباتِ ذات، اظہارِ ذات، ارتقائے ذات اور تکمیلِ ذات کے لیے ایک جوشیلی دعوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ہمیں مستقبل کے لیے پُرامید بناتے ہیں اور روشنی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری اور اُن کا پیغام اس لحاظ سے آج کی دنیا سے بھی ویسا ہی علاقہ رکھتا ہے جیسا اس کلام کی تخلیق کے وقت رکھتا تھا۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ آج کی دنیا سرمایہ داری، اشتراکیت، قومیت، لادینیت اور مختلف قسموں کی آمریت اور مختلف اسلوبوں کی جمہوریت کے باہمی متحارب و متخالف عمل و تعامل کے زیرِ اثر ہے۔ نام نہاد آزاد دنیا میں مذہب کو ثانوی حیثیت میں دھکیل دیا گیا ہے۔ اشتراکی اور لادینی معاشروں میں مذہب کا وجود ہی خطرے میں ہے۔ اور ان ممالک میں بھی جو مذہب کے نام پر تشکیل دیے گئے ہیں، مذہبی عقائد واصول واقدار کے ساتھ صرف زبانی ہمدردی ظاہر کی جاتی ہے۔ انھیں عمل کا جامہ نہیں پہنایا جاتا۔ ایسی پُراندوہ صورتِ حال لازماً نئی نسل کے ذہن میں پراگندگی اور تشکک پیدا کرتی ہے کیوں کہ یہ تضادات سے بھرپور ہے۔ یہ پراگندگی و تشکک فطری طور پر کسی اصول یا قدر سے وابستگی کا فقدان پیدا کرتے ہیں۔ اور شاید ایمان و وابستگیِ اقدار سے عاری روح سے زیادہ الم انگیز چیز دنیا میں اور کوئی نہیں ہے آج کے انسان کا سب سے زیادہ مبارزت طلب مسئلہ یہی ہے کہ ایک حوالۂ نسبتی دریافت کیا جائے اور اس سے وابستہ رہا جائے۔ جس کے ذریعے افکار، جذبات اور اعمال کی درستی و نادرستی کا فیصلہ کیا جا سکے۔ سوال یہ ہے کہ علامہ اقبال اس سلسلے میں آج کے انسان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟۔ اس سوال کا جواب پُرزور اثبات میں ہے۔ علامہ نہایت موثر طریقے پر اپنے کلام میں سرمایہ داری، اشتراکیت، آمریت، جمہوریت، وطنی قومیت، نسلی قومیت، لادینیت اور آخرت پرست خانقاہی تصوّف۔ غرض سب کی خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بہترین اصولوں کو خاکہ دینے والے ایک واضح و مستقل حوالۂ نسبتی نوعِ انسانی کے پاس موجود ہے جسے عرفِ عام میں اسلام کہتے ہیں۔ وہ بنی نوعِ انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ اسلام انسانی فطرت کی اساسی اچھائی پر یقین رکھتا ہے۔ اور زندگی کو جینے اور سعی و کوشش سے نتیجہ خیز بنانے کے لائق قرار دیتا ہے۔ اسلام انسان میں ایسی وسیع النظری پیدا کرتا ہے جو نسلی، لونی، جغرافی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو بالکل اہمیت نہیں دیتی اور اسے اجتماعی عدل کے حصول و شیوع پر مائل کرتی ہے۔ اجتماعی عدل کی ضرورت اور اس کا مطالبہ کیا آج کی سب سے بڑی حقیقت نہیں ہے؟

علامہ اقبال یاد دلاتے ہیں کہ اسلام کا معاشرتی نظام عالمی اتحاد کے لیے توحید کے اصول میں بنیاد فراہم کرتا ہے، یعنی اللہ کی وحدانیت پر کامل یقین نوعِ انسانی کے لیے مرکزِ وحدانیت ہے۔ اور اسلام بہ حیثیت ایک دین کے اس اصولِ توحید کو نوعِ انسانی کی ذہنی و جذباتی زندگی میں ایک زندہ و پائندہ عامل بنانے کا محض ایک ذریعہ ہے۔ اسلام خدا سے وفاداری کا مطالبہ کرتا ہے۔ نہ کہ تخت و تاج سے۔ اور چونکہ تمام زندگی کی آخری روحانی اساس اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ سے وفاداری گویا اصل میں انسان کی خود اپنی فطرتِ صحیح سے وفاداری کے مترادف ہے۔" توحید کا اصول موجودہ نسلی، قومی، لسانی اور جغرافیائی عصبیتوں میں بٹی ہوئی دنیا کو اس کی متکمل وحدت دوبارہ عطا کرتا ہے۔ اور متوازن فکر کے ارتقا کو روکنے والی ثنویتوں کو دور کرنے کی قوتِ محرکہ مہیّا کرتا ہے۔ توحید پر اسلام نے جس قدر زور دیا ہے، کسی اور دین نے نہیں دیا۔ اور علامہ واضح کرتے ہیں کہ توحید پر یقین سے انسانی مساوات پر یقین کا عقیدہ خود بہ خود پھوٹتا ہے جس کی آج دنیا کو شدید ضرورت ہے۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات و اقدار تقویم پارینہ نہیں ہیں جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں جو اسلام کو اس کے اپنے فضائل و محاسن کی بنیاد پر نہیں جانچتے بلکہ اسے امتِ مسلمہ کے زمانی و مکانی جہت میں حاصل کردہ تجربے سے خلط ملط کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ اساسی روح اور تاریخی خول میں تفریق نہیں کرتے۔ ضروری ہے کہ اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے، ایک طریقِ حیات کی حیثیت سے جس کی تعلیم اور جس کا عملی نمونہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کبار نے پیش کیا تھا دیکھا جائے نہ کہ ملتِ مسلمہ کے تاریخی تجربے کی حیثیت سے۔ چنانچہ اسی لیے علامہ اسلامی فکر کی مابعد الطبیعیات کو نئے سرے سے بیان کرتے ہیں۔ وہ اسلام کے اولین اصولوں کو نئے زمانے کی اصطلاحات و تصورات کے سانچے میں ڈھال کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ جدید ذہن کے لیے نا قابلِ فہم ہو جائیں۔ وہ اسلام کی تشکیلِ نو ایک طرف تو اسلام کی فلسفیانہ روایت کو نظر میں رکھتے ہوئے اور دوسری طرف انسانی علم کے مختلف دائرہ میں تازہ انکشافات اور دریافتوں کو نظر میں رکھتے ہوئے کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک انسانی ترقی کی تاریخ میں اسلام کا حقیقی کردار تمام نوعِ انسانی کو توہم پرستی، اسناد پرستی اور اسلاف پرستی سے ہٹا کر عقلیتی طرزِ فکر کی طرف موڑنا اور طبعی، اخلاقی اور روحانی مسائل میں استخراجی رویے سے ہٹا کر استقرائی رویے کی طرف مائل کرنا ہے۔ استقرائی طرزِ فکر ہی سائنٹیفک طرزِ فکر ہے۔ اور علامہ یاد دلاتے ہیں کہ اسلام ہی نے سب سے پہلے انسان کو استقرائی طرزِ فکر کی طرف متوجہ کیا۔

علامہ اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ اسلام ایک حرکی مذہب ہے۔ بایں معنی کہ یہ زندگی کے بدلے ہوئے حالات میں اپنی تعلیمات کی تعمیرِ نو اور تشکیلِ نو کی اجازت اجتہاد کی شکل میں دیتا ہے۔ اجتہاد کا مطلب ہے کسی مشکل مسئلے پر کسی قرآن و حدیث سے واقف شخص کا اپنے علم اور ذہن و فکر کو کام میں لا کر ایک قانونی حل مستنبط کرنا۔ دینِ اسلام کے بارے میں علامہ کا یہ رویہ ایسا ہے جس سے ہمیں اپنے موجودہ علمی، آئینی، قانونی اور معاشرتی مسائل کو اسلام کی بنیاد پر حل کرنے کے لیے ایک واضح نقشہ مل جاتا ہے۔ اس سیاق و سباق میں علامہ اقبال کی موجودہ دور میں اہمیت پوری امتِ مسلمہ کے لیے عموماً اور اہلِ پاکستان کے لیے خصوصاً کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اجتہاد ہی وہ کلید ہے جس سے دورِ حاضر کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور قانونی مسائل اسلامی تعلیم کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے حل کیے جاسکتے ہیں۔

جب علامہ اقبال اپنے قارئین کی توجہ مسائل کے حل کے لیے اسلامی اقدار اور اسلامی تعلیمات کی طرف دلاتے ہیں تو مقامی و محدود یا فرقہ پرست نہیں بن جاتے۔ کیوں کہ ان کے پیغام کا جوہر ہمیشہ انسانی اور ہمہ گیر ہوتا ہے، نہ کہ عقائدی حدود کا پابند وہ ہمیشہ اسلام کو عالمی مسائل کے ساتھ مربوط کرتے ہیں۔ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے مسائل ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہتے ہیں۔ ان کی نگاہ آفاقی ہے۔ اپنے ایک خط میں ڈاکٹر نکلسن کو وہ لکھتے ہیں: "میری فارسی نظموں کا مقصد اسلام کی وکالت کرنا نہیں، میرا مقصد تو محض ایک آفاقی معاشرتی تعمیرِ نو کو دریافت کرنا ہے۔ اور اس کوشش میں مجھے منطقی طور پر غیر ممکن نظر آتا ہے کہ ایک ایسے معاشرتی نظام کو نظر انداز کر دوں جس کا برملا مقصد ہے۔ ذات پات رتبے اور نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا اور جو اس دنیا کے امور پر گہری نظر رکھتے ہوئے بھی غیر دنیاوی جذبہ پیدا کرتا ہے۔ جو انسان کے اس کے ہمسایوں کے ساتھ تعلقات کے لیے بے حد ضروری ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی یورپ میں کمی ہے۔ اور یورپ اب بھی ہم سے سیکھ سکتا ہے"۔ اس خط میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں: "اللہ تعالیٰ کی ارضی بادشاہت سبھی انسانوں کے لیے ہے، نہ کہ صرف مسلمانوں کے لیے۔ بشرطیکہ وہ قومیت اور نسل کے بتوں کو پوجنا چھوڑ دیں۔ اور ایک دوسرے

کے ساتھ انسانی شخصیتوں جیسا سلوک کریں۔ انسان کی نجات سب کے لیے مساوات اور آزادی میں پنہاں ہے۔" اسی طرح یکم جنوری ۱۹۳۸ء کے سالِ نو کے پیغام میں کہتے ہیں: "دیا در کھیے اس دنیا میں انسان صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ نوعِ انسانی کا احترام کرے۔ صرف ایک وحدت معتبر ہے اور وہ وحدت انسانی برادری کی ہے۔ جو نسل، قومیت، رنگ اور زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک کہ یہ نام نہاد جمہوریت، یہ غیر معقول قومیت اور یہ اخلاق باختہ ملوکیت پاش پاش نہیں ہو جاتی۔ جب تک کہ انسان اپنے افعال و اعمال سے اس کا مظاہرہ نہیں کرتے کہ وہ ساری دنیا کو اللہ تعالیٰ کا کنبہ سمجھتے ہیں۔ جب تک کہ نسل، رنگ اور جغرافی قومیتوں کے امتیازات مٹ نہیں جاتے انسان ایک شاداں و پُر قناعت زندگی بسر کرنے کے اہل نہیں ہوں گے۔ اور آزادی، مساوات، اخوت کے خوبصورت لفظ العین روبہ عمل نہیں آسکیں گے۔" علامہ اقبال نے ان خطوط اور پیغامات میں جو کچھ قطعیت و صراحت کے ساتھ واضح نثر میں کہا ہے۔ یہی کچھ وہ اپنی فارسی اور اردو شاعری میں جذبے اور تاثر تخیل و تمثیل سے معمور مترنم اور ایمائیت سے بھرپور الفاظ میں کہتے ہیں۔ ان کے پیغام اور ان کے رویّے کی وسعت و عظمت ان کے کلام کو عظمت عطا کرتی ہے۔ اور ان کے اظہار کی موزونیت اسے حسن بخشتی ہے۔ اور اگر وہ اپنے خیالات و تاثرات کو اپنی ثقافت اور اپنے معاشرے یعنی اسلام سے اخذ کردہ اصطلاحوں اور تمثالوں کے وسیلے سے پیش کرتے ہیں، اور انسانیت کے ایک وسیع وژن کی دعوت دیتے ہوئے ایک تاریخی اور فلسفیانہ صداقت یعنی اسلام کے تاریخی کردار کا حوالہ دیتے ہیں۔ تو کیا اس بنا پر ہم انھیں مقامی و محدود و فرقہ وارانہ شاعر قرار دیں؟ ایسا کرنا حد درجے کی ناانصافی اور غیر معقولیت ہوگی۔ علامہ کے افکار و تعلیمات ان کے یقین کردہ نصب العین اور وژن ساری نوعِ انسانی کے لیے ہیں، کسی مخصوص طبقے کے لیے نہیں۔ اور ہمارے لیے آج بھی وہی اہمیت و معنویت رکھتے ہیں، جو ان کے اپنے دور میں رکھتے تھے۔ علامہ اقبال کی شاعری وقتی و مقامی نہیں ہے بلکہ ہمارے ہم عصر ہے اور مستقبل کے لیے بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی حال کے لیے۔

بعض نکتہ چین علامہ اقبال پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ روحانی و علمی قدروں پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں اور اتنی اونچی پرواز کرتے ہیں کہ اس روز مرّہ کی مادی دنیا سے ان کا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے جس میں عام لوگ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ اعتراض نکتہ چینوں کی کم حوصلگی اور پست نظری پر مبنی ہے۔ صحیح صورت حال یہ ہے کہ علامہ نہ تو ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو محض انسان کی قیمتی روح سے سروکار رکھتے ہیں اور دنیا سے دست کش ہو کر خلوت میں مراقبہ کر کے امن و سکون حاصل کرنے کے قائل ہیں۔ اور نہ ہی وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو زندگی کا مفہوم مکمل طور پر اس کے مادی مظاہر میں ڈھونڈتے ہیں اور ترقی کو پیداوار میں اضافے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ علامہ کا خیال یہ ہے کہ انسان کی حقیقی اور پائیدار نجات ترکِ دنیا کرنے یا رہبانیت اختیار کرنے میں نہیں ہے، بلکہ انسانوں کو اسی مادی دنیا میں یہیں پر باہم عدل و انصاف اور اخلاص و شائستگی کے ساتھ رہنا سیکھنا چاہیے۔ انھیں اسی دنیا میں یہیں پر اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو فروغ دینا چاہیے۔ اور فطرت کی قوتوں پر تسلط حاصل کرنا چاہیے۔ اور انھیں نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے کام میں لانا چاہیے۔ انھیں اسی دنیا میں یہیں پر اللہ تعالیٰ کی تخلیقی سرگرمی میں اس کا ہم کار بننا چاہیے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ارضی بادشاہت قائم کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ گو علامہ اس مادی دنیا اور اس گوشت پوست کے انسان کے مقتضیات اور مطالبات کو تسلیم کرتے ہیں، انھیں ہرگز مسترد نہیں کرتے۔ لیکن وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اسی مادی عالم اور اسی طبیعی زندگی سے ساری حقیقت عبارت ہے۔ اور انسان کو صرف اس کے مسائل اور دلچسپیوں سے سروکار رکھنا چاہیے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کی خلّاقی صرف مادے کی تشکیلِ نو تک محدود نہیں ہے۔ مادی ترقی اور تسخیرِ فطرت کا خیر مقدم

صرف اسی حد تک کرنا چاہیے جس حد تک وہ انسان کی روحانی زندگی کو مدد پہنچاتے ہیں۔ انسان اس کی بھی اہلیت رکھتا ہے کہ اپنے باطنی وجود کی گہرائیوں میں ایک وسیع تر دنیا تعمیر کرے جہاں لامحدود مسرت اور تخلیقی فیضان کے سرچشمے دریافت کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً فلسفے اور مذہب، ادبیات اور علوم، آرٹ اور شاعری میں ان ثقافتی اور روحانی قدروں کی جستجو میں انسان کو چاہیے کہ اپنی طبیعی دنیا کو خام مواد کے طور پر استعمال کرے اور انسانی روح کی ارتقائی حرکت کو زور دار بنانے کے لیے دنیوی امکانات کو مصرف میں لائے۔ صداقت یہ ہے کہ عمل پذیر کرنے میں کوئی ارتقائی حرکت اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کہ یہ حرکت اپنا آغاز اسی مادی دنیا کے رنج و راحت سے کر کے اپنا راستہ نہ دریافت کرے۔ سچ یہ ہے کہ علامہ اقبال انسان کی وحدت کو روح اور مادے کی دوئی میں تقسیم کرنے کے قائل ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں، اسلام میں اللہ تعالیٰ اور کائنات، روح اور مادہ، کلیسا اور ریاست ایک دوسرے کے لیے ترکیبی و نامی حیثیت رکھتے ہیں۔ انسان ایک نجی دنیا کا شہری نہیں ہے، جسے کسی اور جگہ واقع دنیائے روح کی خاطر ترک کر دیا جائے۔ اسلام میں مادہ نام ہے روح کا جو اپنے آپ کو زمان و مکان میں عمل پذیر کرتی ہے۔

اس طرح علامہ اقبال بیسویں صدی کے پراگندہ فکر اور چکرائے ہوئے انسان کو ایک احساس جہت عطا کرتے ہیں۔ اسی واقعی اور قابل عمل حل کا نام ان کے نزدیک اسلام ہے۔ اسلام کا لفظ سنتے ہی بعض لوگ بھڑک جاتے ہیں کہ یہ چودہ سو سال پرانی باتیں آج کے ترقی یافتہ دور میں دہرائی جا رہی ہیں۔ ان بھڑکنے والوں کے ذہن میں دراصل اسلام کا محض عقائدی تصور ہوتا ہے — اسلام کی اخلاقی، معاشی، اقتصادی، سیاسی اور تہذیبی اقدار و تعلیمات کا تصور نہیں ہوتا، اسی لیے وہ اسلام کے نام پر بھڑک جاتے ہیں۔ اقبال نے اسلام کا جو وسیع اور ہمہ گیر تصور پیش کیا ہے۔ اور موجودہ دور کے لیے اسلام کی تعلیمات و اقدار کو جس طرح پُر معنی اور اہم ثابت کیا ہے۔ اسے ہم سرسری طور پر یہ کہہ کر علیحدہ یا مسترد نہیں کر سکتے کہ یہ پرانی باتیں ہیں۔ بے وقت کی راگنی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ "اسلام ایک ناقابلِ تجزیہ حقیقت ہے۔ جو تصوری اور حقیقی کے رابطے کو تسلیم کرتا ہے، اور دنیائے مادہ کو قبول کرتا ہے اور اسے تسخیر کرنے کا راستہ دکھاتا ہے تاکہ زندگی کی حقیقت پسندانہ تنظیم کے لیے ایک مضبوط اساس دریافت کرے۔" اسلام کا مقصد عالمی اخوت سے کم کسی منزل پر قیام کرنا نہیں ہے۔ انسان نوع انسانی کے لیے اس مادی و حقیقی دنیا میں امن و خوشحالی اور عزت و وقار کو اور روحانی زندگی کے دائرے میں آسودگی اور روشنی کو اپنا مقصد بناتا ہے۔ سچ پوچھیے تو علامہ اقبال کی آواز درحقیقت نسلِ انسانی کی نجات و فلاح کے لیے تقدیر کی آواز ہے۔ انسان کو اگر اس کرۂ ارض پر عافیت کے ساتھ زندہ رہنا ہے تو اس آواز پر کان دھرنے چاہئیں اور اسلام کی تنگ نظر تقلید اور محدود تعبیرات کو ترک کر کے اس تعبیر پر توجہ دینی چاہیے، جو علامہ اقبال نے پیش کی ہے۔ اس تعبیر کو قبول کر کے اس پر عمل کرنے میں ہماری نجات ہے۔ یہی ہے تیرے لیے اب صلاحِ کار کی راہ

خاطر غزنوی

شاعرِ مشرق کے حضور

نوائے عجز ہوں کیوں کر تجھے خطاب کروں
میں ذرّہ کس طرح تحسینِ آفتاب کروں

بھٹک رہا ہوں تری وسعتِ تخیّل میں
کہاں شعور کہ مفہوم بے حجاب کروں

سمجھ سکا تری دانش کی ابتدا بھی نہیں
تو کیف و کم کا تری کس طرح حساب کروں

ترے شعور کی دنیا کے صد ہزار ہیں رنگ
میں بے بصر ترا کیا رنگ انتخاب کروں

رموزِ عشق و جنوں تک پہنچ سکی نہ خرد
میں کس حوالے سے جاں وقفِ پیچ و تاب کروں

میں اپنی ذات کی تاریکیوں میں گم ہوں ابھی
خودی کا سرِّ نہاں کیسے بے نقاب کروں

اگر قبول کرے تیری بارگاہِ کمال
یہ خام نغمہ ترے نام انتساب کروں

اقبال اور تحریکِ پاکستان

پروفیسر میاں محمد صادق

اِک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو — لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
صفتِ برق چمکتا ہے مرا فکرِ بلند — کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی

علامہ اقبال عالمِ اسلام اور برصغیر پاک و ہند کی جدوجہد آزادی کے اس پس منظر میں پیدا ہوئے جب ملتِ اسلامیہ خلافت کے بعد ملوکیت کا شکار ہو کر حریت کے اس جذبے سے محروم ہو چکی تھی جس کے طفیل مسلمان پوری دنیا سے ٹکرا گئے تھے اور قومی سطح پر برصغیر پاک و ہند کے مسلمان اپنا قومی تشخص پامال کر کے احساس کمتری کا شکار ہو چکے تھے۔ چناں چہ ان حالات میں جہاں مسلمانوں کا اقتدار زوال پذیر ہوتا گیا۔ انگریزی اقتدار کی گرفت دن بدن مضبوط ہوتی چلی گئی۔ تاہم ایک عرصہ گزرنے کے بعد انگریز حکمرانوں کے ظلم و ستم، معاشی زبوں حالی، سیاسی چپقلش خوف و ہراس اور شک و شبہ کی فراوانی نے مسلمانوں کو جھنجوڑ کر وہ حالات پیدا کیے، جب کسی قوم کی حالت جمود اپنی انتہا کو پہنچ کر تحریک اور برانگیختگی کے عمل کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور کوئی ابراہیم گرز سے کر بتوں کو پاش پاش کر دیتا ہے۔

چنانچہ اس صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے جہاں عالمی سطح پر شمالی افریقہ میں محمد علی سنوسی کی تحریک آزادی، جمال الدین افغانی کی پان اسلام ازم کی تحریک اور محمد عبدہ، مفتی اعظم مصری کی کوششوں نے بے مثال کردار ادا کیا۔ وہاں برصغیر پاک و ہند میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ایک طرف اجتہاد کو اپنایا اور دوسری طرف جہاد کا درس دے کر احمد شاہ ابدالی سے امداد طلب کی اور مرہٹوں کا سر کچلنے کی ٹھانی۔ اس کے ساتھ ساتھ شاہ عبدالحئ، شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلوی کی کوششیں بھی اسی فکر اور عمل کا شاخسانہ ہیں۔

اس کے بعد، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی انگریزی اقتدار کے خلاف مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ جنگ تھی جس نے انگریزی اقتدار پر کاری ضرب لگائی۔ اگرچہ وسائل کی کمی اور قیادت کے فقدان کے باعث مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہوئے تاہم اس تحریک نے بنیادیں ضرور فراہم کر دیں۔

جنگ آزادی کے فوراً بعد سر سید احمد خان کی ہمہ گیر سیاسی، سماجی، ادبی اور تعلیمی شخصیت نے اپنے رفقار کار کی مدد سے اس مشن کو آگے بڑھایا اور مولانا حالی نے مسدس حالی لکھ کر قومی شاعری کی بنیاد ڈالی جن شعراء کرام اور نامور دانشوروں نے اپنی شاعری اور سیاسی سرگرمیوں کی بدولت اس تحریک کو تقویت بخشی ان میں علامہ اقبال کی شخصیت مرکزی اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

علامہ اقبال کی سوانح حیات، شاعری، خطبات اور خطوط کا بغور تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ جہاں اقبال کی فکر اور شاعری اندھیری شب کے مسافروں کے لیے قندیل کا درجہ رکھتی ہے۔ بے تیغ و سناں جنوں آمیز اور خوں ریز ہے جو اُن کی تن آسانی، بیز خون کے آنسو بہاتی اور انہیں سوز جگر بخشتی ہے اور لاہور سے تا بخارا و سمرقند ولولۂ تازہ بخش کر انہیں مفکر اسلام حکیم الامت

اور شاعر مشرق بناتی ہے وہاں برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں انہوں نے نظریاتی اور عملی طور پر جو کردار ادا کیا ہے۔ انہیں قائداعظمؒ کا ادبی مجاہد اور مصوّر پاکستان بننے کا بھی شرف عطا کرتی ہے۔ چناں چہ قائداعظمؒ کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں۔

"میں ذاتی طور پر ایسے معاملات کے لیے جو اسلام اور ہندوستان دونوں کے لیے خطرہ ہوں، جیل جانے سے کبھی گریز نہیں کروں گا۔"

اپنی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں:-

"وہ لوگ مجھ سے حدیث دلبری اور آب و رنگ شاعری کی توقع رکھتے ہیں لیکن یہ بے خبر اس ہیجان اور طوفان سے ناواقف ہیں جو میرے دل میں بپا رہتا ہے۔"

علامہ اقبال کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کو اگر ہم صرف اور صرف تحریک پاکستان کے آئینے میں دیکھیں تو اس تحریک سے ان کی وابستگی دو صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

۱۔ اقبال اور عملی سیاست،

۲۔ اقبال اور فکری قیادت

شروع شروع میں اقبال عملی سیاست سے کنارہ کش رہے اور اپنی عملی استعداد، شاعرانہ اور فلسفیانہ بصیرت کی بدولت جو شہرت عام حاصل کر چکے تھے اسے کافی سمجھا۔ چناں چہ جب علامہ کو عملی سیاست کے لیے مجبور کیا گیا تو انہوں نے ایک معذرت نامہ لکھا۔ جو دلچسپ بھی ہے اور اقبال کے ابتدائی خیالات و نظریات کا علم بردار بھی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہوس کبھی ہو تو نہیں مجھ میں ہمت تگ و تاز — حصول جاہ ہے وابستۂ مذاقِ تلاش
ہزار شکر طبیعت ہے ریزہ کار مری — ہزار شکر نہیں ہے دماغ فتنہ تراش
مرے سخن سے دلوں کی ہیں کھیتیاں سرسبز — جہاں میں ہوں میں مثال سحاب دریا پاش
یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں — کہ فیض عشق سے ناخن مرا ہے سینہ تراش

آہستہ آہستہ ان خیالات میں تبدیلی پیدا ہوئی اور احباب کے پر زور اصرار پر علامہ اقبالؒ ۱۹۲۶ء میں باقاعدہ طور پر پہلی مرتبہ عملی میدان میں آئے اور پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کے لیے انتخاب میں حصہ لیا۔ اس سلسلے میں اخبارات نے اداریے لکھے کہ علامہ کی شہرت اور علمی رفعت کے پیش نظر انہیں بلا مقابلہ منتخب ہو جانا چاہیے۔ چناں چہ دو جلیل القدر امیدواروں نے اپنے نام واپس لے لیئے جب کہ خان بہادر ملک محمد دین دست بردار نہ ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ کو باقاعدہ تیاری کرنا پڑی اور لائحہ عمل تیار کیا۔ ایک بہت بڑا جلسہ چوک وزیر خان میں منعقد ہوا اور احباب کے اصرار پر علامہ اس میں خود شریک ہوئے اور تقریر فرمائی، بالاخر آپ تین ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہو گئے۔ یہ پہلا سیاسی معرکہ تھا جس میں ایک عظیم شاعر اور فلسفی سیاست کے عملی میدان میں کامیاب ہوا۔

کامیابی کے بعد علامہ نے بہت سے مذہبی پیشواؤں اور عبادت گاہوں کی تحریم و تکریم کے لیے تحریک پیش کی اور ۱۹۲۷ء میں یہ قانون پاس ہو گیا۔ اسی زمانے میں علامہ اقبالؒ نے قائداعظمؒ کے چودہ نکات پر پر زور تنقید کی۔ جس سے مسلمان سیاست دانوں میں اختلافات پیدا ہو گئے اور بالاخر ۳ مئی ۱۹۲۷ء کو قائداعظمؒ نے تصریحات پیش کر دیں۔

۲۰ جون ۱۹۲۷ء کو پنجاب مسلم لیگ (شفیع گروپ) کے جنرل سیکرٹری کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس کے بعد برصغیر کی سیاست انتشار کا

شکار ہو گئی اور متفقہ طور پر سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا گیا۔ لیکن علامہ اقبال نے شفیع لیگ کی نمائندگی کی اور ۵ر جون ۱۹۲۸ء کو کمیشن کے سامنے اپنا نقطۂ نگاہ پیش کیا۔ جس پر کمیشن نے بہت سے معاملات میں ان کی تائید کی۔ اگست ۱۹۲۸ء میں آپ نے مسلم لیگ (شفیع گروپ) کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے نہرو رپورٹ پر تنقید کی جس میں مسلمانوں کی حق تلفی کی گئی تھی۔

۳۰ر جون ۱۹۳۰ء کو متحدہ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔ اور الٰہ آباد کے مقام پر اپنا تاریخی خطبہ پیش کیا۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی اور اس کے خاتمے پر غلام رسول مہر کے ہمراہ فلسطین تشریف لے گئے جہاں موتمر عالم اسلامی میں مسلمانانِ ہند کے نمائندے کی حیثیت سے مدعو تھے۔

۱۹۳۲ء میں لاہور کے مقام پر آل انڈیا مسلم کانفرنس کی صدارت کی اور خطبۂ صدارت پیش کیا اور تیسری گول میز کانفرنس میں بھی شرکت کی۔

۱۹۳۴ء میں اقبال عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور وطن کے اسلامی تصور اور اسلامی ریاست کے قیام سے متعلق امور ان کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ ۱۹۳۵ء میں قائد اعظم کی درخواست پر خرابیٔ صحت کے باوجود پارلیمانی بورڈ کا کام اپنے ذمے لیا اور ۱۹۳۶ء میں دوبارہ مسلم لیگ میں تنظیم پیدا کی۔

۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال قائد اعظم کے مشیر خاص بن گئے جس کا اعتراف قائد اعظم نے ان الفاظ میں کیا کہ مشکل اور آزمائش کے لمحات میں علامہ اقبال ان کے لیے سکون اور استقلال کا ذریعہ ثابت ہوئے۔

تحریکِ پاکستان کے اس تسلسل کی روشنی میں دیکھا جائے تو ایک شاعر اور عظیم فلسفی کی عملی سیاست میں اس قدر وابستگی انتہائی حیرت انگیز اور بے مثال معلوم ہوتی ہے۔

عملی سیاست کے شانہ بشانہ علامہ کی فکری اور نظریاتی قیادت بے مثال کارنامہ ہے جو کہ تحریکِ پاکستان سے ان کی وابستگی کا دوسرا رخ ہے۔ ان نظریات کی بدولت علامہ نے مسلمان سیاسی اکابرین کی مثبت اور تعمیری رہنمائی فرمائی جو بالآخر قیامِ پاکستان کی صورت میں سامنے آئی۔

شروع شروع میں اقبال نظریہ وطنیت کے حامی تھے۔ جب خاکِ وطن کا ہر ذرہ انہیں دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ اس دور میں جہاں وہ جغرافیائی حدود میں دلچسپی لیتے تھے وہاں مختلف مذاہب میں اتحاد و یگانگت کے رشتے تلاش کر کے وطن پرستی کے لیے بنیادیں فراہم کر رہے تھے۔ چناں چہ اس دور کی نظمیں "ترانۂ ہندی"، "ہندوستانی بچوں کا گیت"، "نیا شوالہ" اسی رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں۔

لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد اقبال کے سیاسی نظریات میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہوئی۔ جو قیامِ یورپ اور تاریخ اسلام اور خصوصاً رسولؐ پاک کی حیاتِ طیبہ کے گہرے مطالعے کا نتیجہ تھی۔ اس دور میں وہ وطنیت کے محدود تصور سے نکل کر ملتِ اسلامیہ کے وسیع تصور کے حامی ہو جاتے ہیں۔ اور نسلی و جغرافیائی حد بندیوں کو توڑنا ان کا جزوِ ایمان بن جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ناموسِ وطن کی حفاظت ناگزیر ضرورت ہے لیکن اسے ملی یکجہتی کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا جا سکتا۔ وطن اور مذہب کی محبت میں تصادم نہیں ہونا چاہیے بل کہ ان میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ کیوں کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اپنی مذہبی روایات کو مذہبی بنیادوں پر استوار کر کے انہیں ملی عزائم سے ہم آہنگ کیا ہے۔ چنانچہ اس دور کی شاعری، خطوط اور تقاریر انہی رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

۱۹۰۹ء میں جب انہیں مسز دالاج امرتسر کے اجلاس میں شمولیت کی دعوت ملی تو آپ نے جواب میں لکھا۔

"میں خود اس بات کا قائل رہا ہوں کہ اس ملک میں مذہبی تفریق کا خاتمہ ہو جانا چاہیے اور اب بھی نجی زندگی میں اسی اصول پر عمل کرتا ہوں۔ لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ ہندوستان کے لیے متحدہ قومیت کا خواب یقیناً ایک خوب صورت نصب العین ہے اور اس میں شاعرانہ جاذبیت ہے لیکن موجودہ حالات اور دونوں قوموں کے لاشعوری رجحانات کے پیش نظر اس کی تعبیر ممکن نظر نہیں آتی۔"

اس کے بعد خطبۂ الہ آباد علامہ اقبال کا بہت بڑا سیاسی کارنامہ ہے۔ یہ خطبہ انہوں نے الہ آباد کے مقام پر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں دیا جس کی اہمیت کے پیش نظر علامہ کو مصور پاکستان کہا جاتا ہے۔

اگرچہ اس سے قبل سرسید احمد خان اردو ہندی تنازعے کے سلسلے میں دو قومی نظریے کی بنیادیں استوار کر چکے تھے۔ تاہم علامہ کا خطبہ مدلل ہے، جامع اور سیاسی حالات کے عین مطابق ہے۔ علامہ نے اپنے اس جلسے میں اسلام کی عالمگیر حیثیت ملک کی سیاسی صورتحال اور برصغیر کے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں تجاویز پیش کیں۔ متحدہ قومیت کے مسئلے پر فرماتے ہیں۔

"مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کی بنیاد کے طور پر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ سارے مسلمان اپنے وطن میں ثقافت اور روایات کے مطابق آزادانہ ترقی کا حق رکھتے ہیں تو وہ برصغیر کی آزادی کے لیے بہت کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ پنجاب، شمال مغرب سرحدی صوبہ سندھ بلوچستان ایک ریاست میں مدغم ہو جائیں۔ مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ برطانوی حکومت کے اندر رہتے ہوئے یا باہر خود اختیاری کا اصول اور شمالی مغربی برصغیر میں مستحکم مسلم ریاست کا قیام مسلمانوں کا مقدر بن چکا ہے۔"

علامہ اقبال نے اپنے اس خطبہ کی بدولت مسلمانوں کے لیے منزل متعین کر دی اور پہلی دفعہ اس بات کا اقرار ہوا کہ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ برصغیر ہے۔ اور مسلمانوں کے وطنی تصورات کی بنیاد نسل اور علاقائی تعصبات پر نہیں بلکہ مذہب پر ہے۔ اگرچہ ہندوؤں اور انگریزوں نے اس بات پر اعتراضات کیے کہ یہ خطبہ پان اسلام ازم کی بنیاد ہے اور اس سے ہندوؤں کی پوزیشن غیر محفوظ ہوتی ہے۔ لیکن ان اعتراضات کے باوجود مسلمانوں نے اسے اپنا مقدر اور اپنی منزل قرار دیا اور بالآخر قائداعظم کی پرکشش شخصیت، عملی جدوجہد، مثالی قیادت اور آئینی جنگ کی بدولت اسے عملی جامہ پہنا دیا۔

علامہ اقبال اور قائداعظم کی خط و کتابت اور تبادلۂ خیالات نے بھی پاکستان کی نظریاتی بنیادیں استوار کیں۔ اگرچہ برصغیر کی تحریک آزادی کے اصلی قائد کا سہرا تو قائداعظم کے سر ہی باندھا جا سکتا ہے لیکن خصوصاً ۱۹۳۷ء میں علامہ قائداعظم کے مشیر خاص بن گئے جس کا اعتراف قائداعظم نے ان الفاظ میں کیا۔

"ان کے خیالات بنیادی طور پر میرے ہم آہنگ تھے اور برصغیر کے آئینی مسائل کا بغور مطالعہ اور تجربہ کرنے کے بعد میں بھی انہیں نتائج پر پہنچا۔"

علامہ نے قائداعظم کے نام جو خطوط لکھے اس میں انہوں نے زیادہ تر مطالبۂ پاکستان کی دینی، مذہبی، تہذیبی اور کلچرل بنیادیں متعین کیں۔ اپنے ایک خط میں فرماتے ہیں۔

"میرے خیال میں واحد وفاقی ہندوستان کا تصور جو دستور جدید میں پیش کیا گیا ہے بالکل مایوس کن ہے۔ اوپر بیان کی ہوئی میری تجاویز کے

مطابق مسلم صوبوں کا جدا گانہ وفاق وہ واحد صورت ہے جس کے ذریعے ہم پُرامن ہندوستان حاصل کر سکتے ہیں اور غیر مسلموں کے تسلط سے مسلمانوں کو محفوظ کر سکتے ہیں۔

المختصر تحریک پاکستان سے علامہ اقبال کی نظریاتی اور عملی وابستگی کا مختصر سا خاکہ جو میں نے پیش کیا ہے اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال برصغیر کی تحریک آزادی کے وہ قومی ہیرو ہیں جنہوں نے نہ صرف شاعری اور خطبات کے ذریعے مسلمانوں کو ولولۂ تازہ دیا اور فکری طور پر سیاسی اکابرین کی رہنمائی فرمائی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عملی میدان میں بھی بھرپور طور پر شریک ہو کر نادر مثال پیش کی ہے۔ علامہ کی انہیں خدمات کی روشنی میں ایک نقاد علی نہاد لکھتا ہے۔

"اقبال دو شخصیتوں کا حامل ہے اپنے انفرادی اور مابعد الطبعی جہان میں وہ وجد و استغراق میں ڈوبا ہوا درویش ہے اور اجتماع و جمعیت کی دنیا میں ایک ایسی زبردست باطنی قوت کا سرچشمہ ہے جس نے طلوع پاکستان کا ارادہ کیا اور اس ارادے کو محمد اقبال لاہوری اور دیگر قابل احترام مجاہدین اور قائداعظم کے توسط سے عملی صورت عطا کی"

علامہ اقبال کی ان بے مثال خدمات کے باوجود ایسے حضرات کی کمی نہیں جنہیں ملت اسلامیہ کے اس خیرخواہ کی ہمہ گیر شہرت اور جامع و مانع شخصیت ایک آنکھ نہیں بھاتی اور بسا اوقات ایسے بیانات دینے میں مصروف رہتے ہیں جو یقیناً غیر معیاری سطحی، جانبدارانہ اور غیر مصدقہ شعور اور سوچ کا نتیجہ ہوتے ہیں ان میں سے بعض انہیں تن آسان اور بے عمل قرار دیتے ہیں اور بعض کے نزدیک ان کے قول و فعل میں تضاد پایا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تمام اعتراضات یا تو مطالعہ کی کمی کا نتیجہ ہیں یا جانبدارانہ سوچ کا نچوڑ۔

اس میں شبہ نہیں کہ علامہ بنیادی طور پر ایک شاعر اور فلسفی ہیں اور انہوں نے دنیا کے دوسرے عظیم شعراء اور فلاسفروں کی طرح تاریخ عالم، فلسفۂ مشرق و مغرب اور مذہب اسلام کا بغور تحقیقی و تنقیدی جائزہ لے کر ہمہ گیر اور آفاقی اصول مرتب کیے جو میرے خیال میں عملی جدوجہد سے بھی زیادہ قیمتی اور لازوال ہیں لیکن جو مختصر سا جائزہ میں نے پیش کیا ہے اگر غیر جانبدارانہ اور مثبت انداز سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ علامہ صرف اور صرف شاعر و فلسفی نہ تھے بلکہ تحریک پاکستان کے اسٹیج پر ان کا کردار بھرپور توانا اور متحرک دکھائی دیتا ہے۔

زندہ قومیں کبھی اپنے اکابرین کی خدمات کو فراموش کر کے انہیں طنز و تعریض کا نشانہ نہیں بناتیں بلکہ ان کی خدمات کو مشعل راہ بنا کر ان سے روح اور غذا حاصل کرتی ہیں۔ ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ فکر اقبال جو یقیناً ایک لازوال خزانہ ہے زندگی کے مختلف معاملات میں اس سے رہنمائی حاصل کریں۔ اور ان کی علمی خدمات اور مساعی جمیلہ کو کسی موقع پر بھی خراج تحسین پیش کرنے سے گریز نہ کریں کیوں کہ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم اس فکری رہنما اور قومی و سیاسی ہیرو کی خدمات کا صحیح حق ادا کر سکتے ہیں۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں

شامِ شہرِ یاراں

رضیہ فصیح احمد

۱۹۸۲ء میں فیض صاحب کے ساتھ ایک شام منائی جا رہی تھی۔ بہت عرصہ بعد کسی تقریب میں جانے کو ٹوٹ کر دل چاہا تھا مگر وہ تقریب نہ ہو سکی۔ احسان دانش صاحب ایک رات پہلے دوسری دنیا کو سدھارے تھے، اور فیض صاحب کی تقریب ملتوی نہیں موقوف ہو گئی تھی۔

مجھے ایک سال پہلے ۲۶ فروری ۱۹۸۱ء کی فیض صاحب کی سترویں سالگرہ کی تقریب یاد آئی۔ اس کا دعوت نامہ پیازی رنگ کا تھا جس پر چند نوادرات کے ساتھ فیض صاحب کی تصویر تھی۔ اور پیچھے یہ عبارت درج تھی۔ "پاکستان کے بین الاقوامی شاعر فیض احمد فیض کی ۷۰ ویں سالگرہ پر کراچی پریس کلب کی جانب سے جمعرات ۲۶ فروری شام ۵ بجے ایک خصوصی تقریب۔ مہمان خصوصی ایلس فیض۔ ممتاز اہلِ قلم اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔"

پریس کلب کے پچھلی طرف شامیانے کے نیچے ڈائس پر بیگم ایلس فیض اور مقررین نشستہ تھے۔ جھٹپٹے کا وقت تھا، ابھی تقریب شروع نہ ہوئی تھی۔ اسی میدان میں ان کی کتاب "میرے دل میرے مسافر"، رسالے، لوٹس اور ان کے ٹیپ فروخت کیے جا رہے تھے۔ کتاب پر شام کا جھٹپٹا سا تھا۔ اور ایک پرندہ اڑ رہا تھا۔ اس وقت کی شام اور اس سرورق میں بے پناہ مشابہت تھی۔ ۲۶ فروری کی اس شام ایک طرف پریس کلب کی کہنہ عمارت تھی جس کی دیوار کے پتھر بے ترتیب تھے۔ سامنے زنگیایا زینہ گول گول گھومتا اوپر جا رہا تھا۔ پانی کی ایک چھوٹی سی ٹنکی اور اس کے پیچھے دیوار سے لگا ہوا ٹنڈ منڈ درخت اپنی ڈھیلی ننگی باہیں جھکائے کھڑا تھا۔ اس پر ایک جھڑوس خالی گھونسلے کے تنکے لٹک رہے تھے۔ نیلے آسمان پر دائیں طرف خزاں زدہ درختوں کے پیچھے چیلیں تیرتی پھر رہی تھیں۔ اور بائیں طرف کی ٹائلیں ٹوٹی بیرکوں کے اوپر کوّے اڑ رہے تھے۔ نیم کے زرد پتے زخم پر رکھے جانے والے پھایوں کی طرح تہہ در تہہ اُن ٹائلوں پر گر رہے تھے۔ مجھے فیض کا شعر یاد آیا:

ع کس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے — دل کے رخسار پر اس وقت تری یاد نے ہاتھ

اور پھر ان کے اشعار یاد آتے ہی چلے گئے۔ فیض کی شاعری میں شام اور شب کا ذکر بہت ہے:

اے شام مہرباں ہو — اے شامِ شہرِ یاراں۔

شہر یاراں کی شام تھی مگر فیض صاحب ہم سے بہت دور کسی اور ملک میں تھے۔ یہ سال گرہ اُن کی غیر موجودگی میں منائی جا رہی تھی۔

اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات مری — ہو نہ ہو، آج پھر ان سے ہے ملاقات مری
شام گلنار ہوئی جاتی ہے دیکھو تو سہی — یہ جو نکلا ہے لیے مشعلِ رخسار ہے کون
شام کے پیچ و خم ستاروں سے — زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے — جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات

———

شام کی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ زرد پتّے برابر ٹوٹی ہوئی ٹائلوں پر گر رہے تھے۔ ایلس فیض ڈائس پر بیٹھی تھیں۔ اُن کے سامنے ایک شمع دھری تھی۔

آج کی شب جب دیے جلائیں اُونچی رکھیں لَو

مجھے فیض صاحب کا شعر یاد آیا۔ روسٹرم پر پنسل سے بنائی گئی فیض صاحب کی تصویر لگی ہوئی تھی جس کا رخ ہماری طرف تھا۔ کیوں کہ ہم پریس کلب کی شکستہ دیوار سے لگے بیٹھے تھے۔ مگر اُن کی نگاہیں سارے سامعین و حاضرین سے ماورا دُور کسی طرف تھیں۔ جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ ایلس فیض نے شمع جلائی۔ کچھ کتابیں پریس کلب کی طرف سے انھیں دی گئیں۔ کچھ کتابیں فیض صاحب کی طرف سے پریس کلب کو دی گئیں۔ فیض صاحب کے مزاج اور شاعری کے دھیمے پن کے برعکس نہایت شعلہ زا تقریریں ہوئیں۔ اور فضا دھواں دھواں ہو گئی۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ قمقموں کی روشنیاں صرف ڈائس تک تھیں۔ میری نظر بار بار اُوپر اٹھ رہی تھی۔ اور میں سوچ رہی تھی، عجیب بات ہے یہاں بیٹھے ہوئے ذرا بھی تو احساس نہیں ہوتا کہ آپ روشنیوں کے شہر کراچی میں بیٹھے ہیں۔ اور وہ بھی اس کے دل، صدر کے علاقے میں۔ نہ کوئی دیو زاد عمارت سایہ فگن ہے، نہ جدید بازار کی خیرہ کُن روشنیاں ہیں، نہ سڑک کی جگمگاہٹیں ہیں۔

ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ — تھک کر ہر سو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ

السعودیہ کا گول مینار نظر آ رہا تھا مگر روشنیاں بجھ چکی تھیں شاید روشنی کے ٹیوب خراب ہو چکے تھے۔ یو بی ایل کے اشتہار میں روشنی تھی۔ وہ بھی صرف ایک حصّے میں، دوسرا حصّہ تاریک تھا۔ کوّے ناریل کے خوبصورت درختوں پر آ آ کر ٹکنے لگے تھے۔ گہرے نیلے رنگ کے آسمان کے پس منظر میں وہ سیاہ نقطے نظر آ رہے تھے۔ چیلیں نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ ٹنڈ منڈ درخت کے سائے میں دیوار پر تین بلّیاں قطار میں آ بیٹھی تھیں منیبہ شیخ نے وہی پرانی دکھ بھری غزل اپنی خوبصورت آواز میں شروع کی جو ماحول کے ساتھ فضا میں پوری طرح رچ بس گئی۔

دونوں جہان تیری محبّت میں ہار کے — وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

اس کے بعد مختلف شاعروں نے فیض صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ایک شاعرہ نے حُسنِ عقیدت کے اظہار کے ساتھ فیض صاحب کی ایک نظم تحت اللفظ سنائی۔ کراچی کا آسمان جو ہمیشہ روشن رہتا تھا، آج تاریک اور سوگوار تھا۔ شاید اس لیے کہ فیض صاحب یہاں نہ تھے۔ ٹیپ پر فیض صاحب کی آواز سنوائی گئی۔ وہی ان کا لاابالی انداز۔ نہ شاعروں کا سا بھرپور دبدبہ، نہ اپنی آواز منوانے کی فکر، نہ لے طرح تکرار، نہ کسی کو مخاطب کر کے کچھ کہنا۔ بس جیسے فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔

مرے دل، مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا

آج کی تقریر کے مقابلے میں یہ اشعار کتنے نرم اور سجل تھے۔ ان تقریروں میں ــــ فیض کی باتیں کم کم تھیں اور اپنا دکھڑا زیادہ تھا ان اشعار میں فیض صاحب موجود تھے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے یہ تقریب غائبانہ نہیں ہے۔ وہ ہم میں موجود ہیں۔ پھر ایک شام جو فیض کے ساتھ منائی جا رہی تھی جس میں جانے کو ٹوٹ کر دل چاہا تھا۔ پھر ایک تقریب غالب لائبریری میں ۲۴ر نومبر کو ہونے والی تھی، جو نہ ہو سکی۔ کیوں کہ اس سے پیشتر فیض صاحب نے دوسری دنیا کے سفر کا ارادہ کر لیا۔ مجھے بے طرح اُن کی ستّرویں سالگرہ کی تقریب یاد آئی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اسی طرح ان کی غیر موجودگی میں ہم اُن کے ساتھ شامیں مناتے رہیں، اُن کی کتابیں پڑھتے اور ٹیپ سنتے رہیں۔ اُس دن میں اُن کی کتاب خرید کر لائی تھی اور ایک ہی نشست میں ساری پڑھ ڈالی تھی۔ پھر کہیں مجھے اُن کی نظم جب قضا آئے گی پڑھنے کو ملی تھی۔
مجھے یقین ہے کہ قضا اُن کے لیے بے طلب بوسۂ لب بن کر آئی ہوگی اور انھیں حیران کر گئی ہوگی۔

اُردو کی منظوم داستانیں

مصنّف

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

صفحات: ۶۹۲ ــــ قیمت: ۲۵ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان۔ بابائے اُردو روڈ۔ کراچی ۱

غزل نما

تعارف و انتخابِ کلام

ہاشمی بیجاپوری

ادا جعفری

نام سید میراں۔ عرف میاں خاں۔ تخلص ہاشمی ہے۔ کہیں کہیں ہاشم بھی ملتا ہے۔ پیدائش ۱۰۴۵ھ کے لگ بھگ۔ وفات ۱۱۰۹ھ مطابق ۱۶۹۸ء۔ مہدوی فرقے سے تعلق تھا اور ہاشمی تخلص اپنے مرشد شاہ ہاشم مہدوی کے ارشاد کے مطابق اختیار کیا تھا۔

ہاشمی کے حالاتِ زندگی ابھی تک مکمل طور پر دستیاب نہیں ہیں۔ اس کے کلام میں جو اشارے ملتے ہیں ان کے مطابق کہا جاتا ہے کہ اس کا اصل وطن برہان پور تھا۔ لیکن قیام بیجاپور میں رہا۔ اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔

ہاشمی بیجاپوری عادل شاہ ثانی کے عہد کا ایک اہم شاعر اور نصرتی کا ہم عصر تھا۔ یہ ثابت نہیں ہے کہ دربارِ شاہ سے اس کا تعلق تھا۔ اپنے زمانے کے دو امیروں سے اچھے تعلقات تھے۔ ان میں سے ایک دربارِ بیجاپور سے متعلق تھا۔ اور دوسرا مغلیہ حکومت سے۔

ہاشمی نابینا تھا۔ اور اپنی اس محرومی کا ذکر اس نے اکثر اپنے اشعار میں بھی کیا ہے۔ لیکن اس کے اشعار میں مناظرِ فطرت کی تصاویر اپنے تمام جمال و دل کشی کے ساتھ نظر آتی ہیں اور مختلف رنگوں کا جس انداز سے اس کے اشعار میں بار بار ذکر آیا ہے اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ پیدائشی نابینا نہیں تھا۔ حسن و رنگ کو اس کی آنکھوں نے دیکھا ضرور تھا۔

ہاشمی ایک پُرگو شاعر تھا۔ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتا تھا۔ اس کی شاعری اس کے دل کی آواز تھی۔ اس کی شاعری کا بنیادی موضوع عشق ہے۔ اور سادگی اور حقیقت پسندی اس کے اشعار کی خصوصیت۔ اس نے اپنے معاشرے اور ماحول کی بڑی سچی عکاسی کی ہے۔ یہ شاعری گجراتی اور قدیم دکنی زبان میں ہے۔ لیکن کہیں کہیں فارسی کی مدد سے ظہور میں آنے والی مستقبل کی زبان اردو کی واضح نشاندہی ہوتی ہے۔ ہاشمی اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے ریختی کو ایک صنفِ سخن کی شکل میں پیش کیا۔ دکنی شعرا نے عموماً ہندی شاعری کے لہجے کی پیروی کی۔ جس کی خاص روایت عورت کی طرف سے جذبات کا اظہار رہا تھا۔ قدیم دور کے تقریباً ہر دکنی شاعر کے کلام میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ہاشمی نے اُس زمانے کی عورتوں کی مخصوص بولی اور محاورے بھی اپنے اشعار میں استعمال کیے۔ اس سے پہلے کسی شاعر نے اُس دور کی عورت کے دکھ درد، اُس کی سوچ کے انداز اور اُس کی زندگی کو اتنی تفصیل سے پیش نہیں کیا تھا۔ اس لیے وہ اردو کا پہلا ریختی گو شاعر کہا جاتا ہے۔

نابینا ہونے کے باوجود ہاشمی نے دُور دراز مقامات کے سفر کیے اور اپنے اشعار میں اُن شہروں کا ذکر کیا ہے۔ ایک مسلسل غزل

احمد آباد کی تعریف میں بھی ملتی ہے۔

اپنے مُرشد شاہ ہاشم مہدوی کی فرمائش پر اس نے مثنوی "یوسف زلیخا" لکھی، جو اردو کی بہترین مثنویوں میں سے ایک ہے۔ اور جسے ہاشمی کا کارنامہ کہا جاتا ہے۔ اس مثنوی کی تصنیف کے وقت وہ بصارت سے محروم ہو چکا تھا۔

مثنوی یوسف زلیخا، کے علاوہ 'دیوانِ ہاشمی' اور کچھ قلمی بیاضیں بھی اس کی یادگار ہیں۔ قصائد بھی لکھے ہیں۔ اس کی زبان میں ہندی، فارسی اثرات کے ساتھ گجراتی کی چھاپ بھی ملتی ہے۔

یہ انتخاب ہاشمی بیجاپوری، مرتبہ محمد احسان اللہ خاں (مطبوعہ ۱۹۸۲ء، فیصل ٹاؤن لاہور) سے کیا گیا ہے۔

انتخابِ کلام

دیکھ چاند، چاند کے تئیں شرموں سے گل پڑے گا — سورج بھی دیکھ بلکہ رشکوں سے جل پڑے گا
شرم — رشک

آنگن میں کی کھڑے ہو، جیوں شمع پہ پتنگ ہو — یوں دیکھ ہر ستارا تم تا پہ ڈھل پڑے گا
کیوں — تم پر

بیٹھی نہ مل سجن سوں، یک بات نئیں کہے ہِن — تو لگ ہو القارہ لشکر کی کھلبلی کا

جھلک سورج سے فاضل ہے سورج سے گال والی کا — بھکاری ہو منگے لالی شفق، لب لال والی کا

ہری چولی کی کیا تعریف کروں اودی ڈور اُس کا — تو گوری خوب لگتا ہے یو تہبند لال اطلس کا

پھونک پھونک رکھتی پاؤں ہیں، ہور یوں ہمن کہتے ستم — کل ار گھے لوگاں میں جب کیا بھیجنے کا تھا گلاب
اور — اتنے لوگوں وجہ

تیری جوانی دیکھ کر رشکوں بڈھا ہو کانپتا — باور نہیں تو دیکھ تو پانی میں تھر تھر آفتاب

تیراں چلا پلک کے مارے ہیں سب جگت کو — بھئی ناز کا لیے ہیں ترہ وار چاند صاحب
بہت — تلوار

تمیں گئے پر میں اوڑھی نئیں نوی جھلکاٹ کی چادر — پھٹی ہوئی اوڑھ لی میں جو پرانی پاٹ کی چادر
تمہارے جانے کے بعد — نئی، چمک دمک

ساقی چلے ہیں کیوں دیکھو تن من مرا ایا مال کر — کالی بلا سی رات کو سینے پہ گئے ہیں ڈال کر

نہ ترس میرا ذرا تم کو خدا کی سوں نہیں ہاشم — گنہ گیا ہے کہو میرا، کیتے ہو تم سو کرتی ہوں
قسم — کہتے ہو

بھنواں دھنک چڑھانے رکھے نین کے خنجر — ہاشم کو مارنے کا نشانہ کیے موہن
بھنویں — محبوب

اے ہاشمی خوشی سے کہتی ہوں تجھ مکرّر — آکر پیا ملے سو آیا ہے راج مج کوں

روں روں میں ناؤں پیو کا بھر کر رہا ہے میرے — اس یاد کے بغیر او پھیکا ہے کاج مج کوں
رواں رواں نام پی — کام

گدا ہو کر منگونگی یوں مرا سب کام ہوئے گا — سخن اب شاہ ہاشم سے درس کا دان جو پاؤں
درشن خیرات

تجھ بن پیا یک تل مجھے کس ٹھار پر گتا نہیں — رو رو فراقوں رات دن یو دکھ بھلانا کو لگوں
لمحہ کسی جگہ گزرتا — یہ کب تک

کیا مجھ پرکھنے کے بدل برہا کسوٹی لائے ہو — سو باریوں ازمانے پر بھی آزمانا کو لگوں
واسطے — آزملنے کب تک

کاں بھاگنا بولو اِیتا اجڑی جلے اس بھاگ سوں — جلنا پڑا ہے رات دن اس بے کلی کی آگ سوں
کہاں اتنا تقدیر سے

پیا جو کچھ کہیں گے تو کہوں گی یو تجھ ہے صاحب — سخن اس کا اڑاؤں نا میں سب تکرار چھوڑی ہوں
یوہی

اگر لاوینگے سوکن کو، رہوں گی اس کی باندی ہو — بی بی آئی پکاروں گی میں سب انکار چھوڑی ہوں

پکاریاں کوئلہ بن میں پیا اب آئیں گے گھر کوں — جھلک بجلیاں اُٹھیاں گھن میں پیا اب آئیں گے گھر کوں

درسن دکھا کے مجھ کو دِوانہ کیے موہن — پلکوں کو تیر سانند نشانہ کیے موہن
محبوب — مانند

کہو کوئی ہاشمی کو جا، اتا آنا جو بھاتا نئیں — خدا کی سوں کٹھن رُت ہے شتابی آؤ ساون میں
اب

اتا ساقی ملیں گے تو مرا سب حال بولوں گی — بچھڑ رہی تھی سو جیو میرا ہوا پامال بولوں گی
اب

سجن آوے تو پردے سوں نکل کر بھار بیٹھوں گی — بہانہ کر کے موتیاں کا پروتی ہار بیٹھوں گے
سے باہر — موتیوں

اس عشق کے دریا منے طوفانِ غم کا زور ہے — یارب تو جیوں تیوں پار کر کشتی یو میرے آس کی

مری تو اوڑھنی سر کی پیا نے ڈھیٹ ہو کھینچی سو ٹکڑے ہو کے رہ گئی ہے کناری ہاتھ میں میرے

اے چاند گورا قد ترا، چادر تنگٹ کی یوں دسے جیوں چاند تارے چھاپ کر اوڑھلے ہے تن بھر اوڑھنی
زری نظر آئے

میں رات اور سورج شفق یک ٹھار دیکھا ہوں عجب کالیاں پٹیاں، گوراچہ موں ہور لال سر پر اوڑھنی
جگہ سیاہ زلفیں منہ اور

کہ یو بات مشہور ہر ٹھور ہے گیا مال جس کا وہی چور ہے
یہ جگہ

مشاہیر یونان و رومہ

جلد اوّل

(حکیم پلوتارک یونانی کی کتاب "السیر" کا اردو ترجمہ)

مترجمہ

مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی

صفحات: ۵۳۰ — قیمت: ۶۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

مشرقی لٹریچر مغرب میں کیوں کر پہنچا

(سر ڈینی سن راس کے ایک مضمون کا ترجمہ)

فیض احمد

[سر ڈینی سن راس کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ مستشرقین میں نہ صرف اپنے علم و مطالعہ کی بنیاد پر بلکہ اپنی متوازن فکر اور متانت کے لحاظ سے بھی ایک نمایاں شخصیت تھے۔ سر سید احمد خاں مرحوم ان سے بہت متاثر تھے۔ اور اپنے پوتے کے نام میں ان کے نام کا ایک جز شامل کر کے "راس مسعود" بنایا اور اس طرح ان سے اپنے تعلق و تاثر کو زندہ جاوید بنا دیا۔

ان کا ایک نہایت اہم مضمون یہاں پیش کیا جا رہا ہے جس سے مشرقی ادبیات سے مغرب کے تاثر اور اس کی تاریخ پر نہایت قیمتی روشنی پڑتی ہے۔ اس نادر مضمون کو ہم جناب پروفیسر تحسین فراقی (لاہور) کے شکریے کے ساتھ پیش کر رہے ہیں] (ادارہ)

اس امر کا تصور دلچسپی سے خالی نہیں کہ پندرہویں صدی میں یورپ کا ایک تعلیم یافتہ اور خواندہ آدمی ایشیا کی کیا خیالی تصویر قائم کیے ہوئے ہوگا، اور چین و ہند کے متعلق اس کا مبلغ علم کیا ہوگا۔ ایشیائی جغرافیہ کے متعلق تو اس کے نظریے محض تخمیناً درست ہوں گے۔ مگر ایشیائی ممالک کے لوگوں کے متعلق اس کی واقفیت سرے سے صفر ہوگی۔ اسے ہندومت اور بدھ مت کا کوئی علم نہیں ہوگا اور اس نے کنفیوشس یا رامائن کا نام تک نہیں سنا ہوگا۔ چنانچہ مشرق کے متعلق جو عدم واقفیت یورپ پر مسلط تھی اس کی تائید میں واقعۂ ذیل کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جب پرتگیز راس امید کا چکر کاٹ کر ۱۴۹۸ء میں سرزمینِ ہند میں اترے تو ان کا خیال تھا کہ ہندستان میں واحد غیر عیسائی مذہب صرف اسلام ہے۔ چنانچہ اپنے ورود پر وہ ایک ہندو معبد میں داخل ہو گئے۔ اور اپنے مع الخیر پہنچنے پر خدائے برتر کا شکریہ اس خیال کے ماتحت ادا کیا کہ وہ ایک عیسائی گرجا میں ہیں جس کے پادری بظاہر راہِ رشد سے کسی حد تک منحرف ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں کی اسلام سے واقفیت بالکل طبعی تھی۔ بالخصوص اس لیے کہ سرزمین اسپین سے آخری مور صرف دس سال پیشتر دیس بدر ہوئے تھے۔ بلکہ مشرق سے وہ کلیتہً ناآشنا تھے۔ اس کے باوجود مشرق اس وقت سے کہیں پیشتر اپنے افسانوں کا انمول تحفہ مغرب کی نذر کر چکا تھا ــــ وہ ہندستان سے دو بڑی بڑی قسطوں میں وارد ہوئے۔ ایک تو وہ جو لقمان نے سنہ عیسوی سے پیشتر مرتب کیے اور دوسرے وہ جو تراجم کی

وساطت سے، از منہ وسطیٰ میں عربی سے عبرانی یونانی اور ہسپانوی زبانوں میں منتقل کیے گئے۔ مگر ان زبان زد افسانوں کے ہندی الاصل ہونے کا احساس اس وقت کیا گیا جب کہ لافان ٹین نے ۱۶۷۸ء کے ایڈیشن میں اس امر کی وضاحت کی کہ اس کی جدید نظموں کی اکثریت بیدپائے ہندی افسانوں پر مبنی ہے۔

تاہم جب ہم مغربی لیٹریچر پر مشرق کے تخلیقی اثرات کا ذکر کرتے ہیں تو کوئی دوسری ایسی خصوصیت نہیں پائی جاتی جو یہودی کتب مقدسہ کے اثرات کے مقابلہ پر آسکے، جو زبان و معانی میں بالکل مشرقی ہیں۔ یورپ میں بائیبل سب چیزوں سے بڑھ کر پڑھی جاتی ہے اور یہ ایک خاص بات ہے کہ انگریزوں کے ہاں کوئی اپنے اساطیر نہیں۔ کوئی ایسی شے نہیں جو انھیں اوثان و اصنام کی جانب منسوب کرے۔ اُن کے ہاں زیادہ سے زیادہ شاہ آرتھر اور اس کی گول میز کا افسانہ ہے جس میں یقیناً فوق العادۃ امور داخل ہو گئے ہیں۔ مگر دوسرے شمالی لوگوں، مثلاً اہل سکنڈے نیویا اور اہل جرمنی کے اپنے باضابطہ اور خصوصی اساطیر ہیں، جیسا کہ ان سے پیشتر یونانیوں اور رومنوں کے ہاں موجود تھے۔ ان اساطیر کی نمائش پہاڑیوں، وادیوں اور دریاؤں پر ہوتی ہے جن سے کہ یہ لوگ مانوس ہیں۔ لیکن حکایات جن پر انگریز بچوں کی تربیت ہوتی ہے تو وہ عہد نامہ قدیم کی کہانیاں ہیں جن کا تعلق محض تمدنی اور اقلیمی حالات سے ہے۔ اور جو ان حالات سے بالکل مختلف ہیں۔ جن سے کہ انگریز اپنے ملک میں مانوس ہیں۔ چنانچہ ہر حکایت کی تشریح بطور واقعۂ دخیل کے کرنی پڑتی ہے اور ایسے لوگوں کی تصاویر دکھانی پڑتی ہیں جو غیر مانوس مشرقی لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ امر محض فطرتی ہے کہ بائیبل نے ان جزائر کی زبان اور لیٹریچر کی تشکیل میں خاص طور پر بڑا کام کیا ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ مشرق نے مغرب پر اپنے ادب و فنون کا اظہار نہایت تمہل سے کیا۔ اور یہ بات نہایت تعجب انگیز ہے کہ ایشیائے مشرقی کی صدہا سالہ تجارت مشرقی تثقیف و تہذیب کا کوئی حصہ اپنے ہمراہ نہیں لائی اور نہ ہی مشرق و مغرب کے شخصی اختلاط میں خواہ وہ سیاسی ہو یا فوجی یا کاروباری، کوئی ایسا قرینہ پایا جاتا ہے جس نے مہذب دنیا کے ان دو نصفوں میں کوئی باہمی تشخص پیدا کیا ہو۔ قدیم ترین زمانوں سے چین اپنا ریشم تجارتی راہوں سے ایران بھی بھیجتا رہا، جہاں سے پھر وہی ریشم یورپ میں جاتا، مگر یورپ کو چین کے متعلق تیرہویں صدی کے وسط تک عملی طور پر کوئی علم نہیں تھا، سوائے اس کے کہ چین ایک ایسا ملک ہے جہاں سے ریشم آتا ہے۔

ساتویں صدی میں فتح مند عربوں نے یورپ پر حملہ کیا اور اس حملہ کا نتیجہ ایک حیرت انگیز کیفیت تھی جس کی رو سے یورپ کے اکثر لوگ اسلامی حکومت کے تحت آگئے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے مشرق و مغرب کے عام مفہوم کے ضمن میں اور موجودہ سیاسیات یورپ پر ترکی اثرات کے ذیل میں ہم بیشتر فراموش کر دیتے ہیں۔

قسطنطنیہ پر عربوں کا پہلا حملہ ۶۶۸ء میں واقع ہوا۔ یعنی حضرت محمدؐ کی ہجرت مکہ کے صرف چھیالیس سال بعد آٹھویں صدی کے وسط سے بیشتر عربوں نے تمام کا تمام اسپین اور پرتگال فتح کر لیا۔ اور یہ صرف چارلس مارٹل کی ذات تھی جس نے ان کی پیش قدمی کا سلسلہ ٹورز اور پاویٹرز کے مابین روک دیا۔ سرزمین یورپ میں عربوں کی موجودگی کی اہمیت جو اپنی مادی اور دماغی طاقتوں کے کمال پر پہنچے ہوئے تھے، ہم ایسے وقت میں قطعاً نظر انداز نہیں کر سکتے جب کہ یونان و روما کی تہذیب قریب قریب کالعدم ہو چکی تھی، اور جنوبی یورپ میں ان کی جگہ نئی اقوام لے رہی تھیں۔ پانچویں صدی کے خاتمہ سے بیشتر روما کی سات پہاڑیوں پر قائم شدہ سلطنت کی

مستحکم تعمیر آخر کار مغربی یورپ کے گوشہ گوشہ میں شمال کی غیر مہذب اقوام کے ہاتھوں منہدم ہو چکی تھی جن کی غیر معمولی طاقت اور ان گنت تعداد کا مقابلہ محض محال تھا۔ اور مذکورہ حملہ آور اپنے ہمراہ سوائے جسمانی طاقت کے تحفہ کے اور کچھ نہ لائے۔ اور یہ امر خلافِ توقع تھا کہ وہ مفتوحہ علاقوں کے علم و فن یا درس گاہوں کی قدر شناسی کا کوئی ثبوت پیش کرتے۔ چنانچہ ۸۰۰ء تک ہمارے سامنے کوئی ایسی نمایاں شخصیت نہیں آتی جس نے ماسبق کی اہمیت کا اندازہ کیا ہو۔ شمالی اقوام کے مابین اشاعتِ عیسائیت نے جس کا آغاز پانچویں صدی کے خاتمہ کے ساتھ ہوا۔ کلیسائی طبقہ کے علاوہ ان فاتح طبقات پر کوئی خوش گوار اثر پیدا نہیں کیا، اور یہ صرف چارلی مین کی ذات تھی جس نے پہلے پہل اپنے لوگوں کی وحشیانہ عادات اور طبعی بغاوت کو قومی اصلاح کے نظریوں سے مانوس کرنے کی سعی کی۔

بلا شک و شبہ، مشرق کا انگلستان پر اولین براہ راست اثر، اہلِ انگلستان کا حروبِ صلیبیہ میں اشتراک تھا جس نے یورپ کی آنکھیں اس تہذیب پر واکر دیں جس کا اہلِ یورپ کو خیال تک نہیں تھا۔ مشرقِ ادنیٰ و متوسط کی وہ تصویر جو عام لوگوں کے ذہن میں بارہویں صدی میں محفوظ تھی غالباً سرے سے غلط تھی۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ لٹریچر کی وساطت سے اسے مصر و ایران اور ہندستان جیسے ممالک کے ناموں سے واقفیت تھی اور بائبل کے ذریعہ سے اسے فلسطین اور عراق و عرب کے متعلق کچھ نہ کچھ علم تھا مگر ان واقعات کے متعلق جو ان ملکوں میں سلطنت روما کے زوال کے بعد رونما ہوئے۔ اسے غالباً کوئی علم نہیں تھا، سوائے اس مزعومہ امر کے کہ ساتویں صدی میں ایک جھوٹا (نعوذ باللہ من ذالک) پیغمبر محمد نام کا پیدا ہوا ہے جو ان دنوں عیسائیوں اور یہودیوں کے مقاماتِ مقدسہ پر قبضہ کیے ہوئے ہے۔ اس وقت عام طور پر لوگوں کا گمان اغلباً یہ تھا کہ محمدؐ کے پیروکار وحشی عرب ہیں جن کے ہاں بہت کم یا سرے سے کوئی تہذیب و شائستگی نہیں۔ انھیں یقیناً کسی ایسے دربار کا خیال نہیں تھا جس کا صدر الصدور ایک بہادر اور مہذب حاکم ہے۔ اور جس کے ہاں اکثر ممالک کے اہلِ علم و فن بکثرت آتے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس حیرتِ مطلق کا تخیل محض محال ہے۔ جو اولین صلیبی جنگ آزماؤں کو اس وقت لاحق ہوئی جب کہ انھیں ان برائے نام جاہلوں کی اہلیت کا علم و احساس ہوا۔ اس قسم کے جو جنگ آزما یونان و اٹلی کی سرزمین سے گزرے انھوں نے محسوس کیا کہ ان ملکوں کی پہلی شان و شوکت جا چکی ہے، مگر جب انھوں نے سرزمین شام میں قدم رکھا تو ایسی طاقت کو اپنے جوبن پر پایا جس کا انھیں خواب و خیال تک نہیں تھا۔

درحقیقت یورپ میں مشرقِ وسطیٰ کے متعلق ذخیرۂ معلومات لانے کا ذریعہ صلیبی جنگجو ہی تھے۔ مگر یہ ذخیرہ محض محدود تھا جو جغرافی حیثیت سے صرف فلسطین، شام اور مصر تک مقیّد اور تنقیدی حیثیت سے اس کی اہمیت یا تو بہت کم تھی، یا سرے سے تھی نہیں۔ صلیبی جنگ آزماؤں کو بادیہ نشینوں سے تعلیم کی کوئی خواہش نہ تھی بلکہ وہ صرف انھیں یروشلم سے خارج کرنا چاہتے تھے اور حتی الامکان انھیں ملیامیٹ کر دینے کے متمنّی تھے۔

سرزمین اسپین پر متمکن ہونے کے بعد باقی یورپ پر عربوں کا فوری اثر مقابلتاً خفیف تھا۔ چنانچہ نویں اور دسویں صدی میں ہمیں ایسی بہت کم شخصیتوں کا علم ہے جن کا علمی مشغلہ عربی زبان کی تحصیل ہو۔ اولین مثالوں میں سے نہایت مشہور مثال پوپ سلوسٹر ثانی (گربرٹ ریمس کے اسقفِ اعظم) کی ہے جس نے دسویں صدی کے خاتمے اور گیارہویں صدی کے آغاز میں بحیثیت ایک عالم و فاضل کے خاصی شہرت حاصل کی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسے عربی اور عبرانی زبانوں میں زبردست مہارت حاصل تھی۔ پوپ سلوسٹر کے بعد فریڈرک ثانی کا نام ہے جو ۱۲۵۰ء میں فوت ہوا۔ فریڈرک ثانی باربروسا اعظم کا پوتا تھا۔ اور اسے ابتدا دخترِ شاہ جان کا خاوند ہونے کی حیثیت

ے انگلستان سے گہرا تعلق تھا۔ فریڈرک نے عربی تصانیف کے مطالعہ اور ترجمہ کی ترویج کے لیے بہت سا کام کیا۔ وہ میکائیل اسکاٹ کا مربی تھا جس نے بوعلی سینا کی "نیچرل ہسٹری" کا ترجمہ کیا۔ یہ امر تو ظاہر نہیں ہوتا کہ قرطبہ یونیورسٹی کے بہت سے فضلا نے باقی یورپ کا سفر کیا ہو، مگر اس قدر یقینی ہے کہ بہت سے یورپین فضلا بالخصوص ڈینٹے کے استاد برونیٹو لیٹنی جیسے مورش اسپین کے عربوں اور یہودیوں کے زیرِ نگرانی تعلیم کے لیے گئے۔ مگر ان تمام امور کے باوجود یہ صرف صلیبی جنگ آزماؤں کی ذات تھی جس نے پہلے پہل یورپ کو اسلام سے حقیقی طور پر روشناس کرایا۔ جب پیٹر راہب نے ۱۰۹۶ء میں پہلی صلیبی جنگ کی تبلیغ کی تو وہ تنقیف جو براہِ راست عیسائیت سے منسوب ہوسکتی ہے اس وقت تک صرف کلیسا تک محدود تھی اور عیسائی یورپ ابھی بچپن کے ابتدائی زمانے میں خیال کیا جاتا تھا۔

بحالیکہ اسلام جو ۶۰۰ برس پیشتر منصۂ شہود پر آیا۔ اس وقت سے قبل اپنے سیاسی عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اور لٹریچر کا ادبی دور گزار چکا تھا۔ سنہ عیسوی کی ابتدائی دس صدیوں میں خلافتِ عربیہ کے ارتقا کی سرعت اور ترقیٔ عیسائیت کی سست عنصری کا مقابلہ دل چسپی سے خالی نہیں کیوں کہ اس مقابلہ سے اس امر کی توضیح ہوتی ہے کہ کیوں کر ہزار سالہ عیسائی ملوکیت کی نمائندہ امارت نے ایسی شان و تہذیب سے محیط امارتِ اسلام کا مشاہدہ کیا جس کی نظیر انھیں اپنے گھروں میں نہیں ملتی تھی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ صلیبی جنگ آزما جو انگلستان واپس آئے کس قسم کے اثرات اپنے ہمراہ لائے۔ اولاً تو ہم یہ امر تسلیم کرسکتے ہیں کہ ان کی ذہنی کیفیت بہت حد تک وسعت پذیر ہوچکی تھی۔ اور وہ محسوس کرنے لگ گئے کہ بادیہ نشیں گو منکرِ عیسائیت ہیں لیکن دوسرے پہلوؤں سے وہ ایسے ہی اچھے انسان ہیں جیسے وہ خود بہادری میں ان کے برابر، اسلحہ میں ان کے ہم پلّہ اور عشرت و امارت پسندی میں ان سے بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک عجیب امر ہے کہ صلیبی لڑائیاں جو ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ تک جاری رہیں، بطورِ خود ملک گیری کے کسی مزید اقدام کا موجب نہ بنیں۔ اس لیے کہ اہلِ انگلستان نے مشرق میں اٹھارہویں صدی کے وسط سے پیشتر کسی قسم کی فوجی پیش قدمی شروع نہیں کی۔ یہاں تک کہ مذہبی مقاصد کی جگہ تجارتی اغراض نے لے لی۔ علاوہ ازیں راس امید کی مشرقی راہ کے انکشاف کے وقت تک بحیرۂ متوسط سے باہر تجارت کا کوئی عندیہ نہیں تھا۔ لہٰذا ہم اس امر کا دعویٰ کرسکتے ہیں کہ ازمنۂ وسطیٰ کے انگلستان کے مشرق سے تعلق کا نتیجہ محض عیش و عشرت، نمائش اور امارت کا اظہار تھا۔ چنانچہ اس دور میں انگلستان پر کسی تنقیفی اثر کا نشان نہیں ملتا کیوں کہ چند ابتدائی تراجم کے قطع نظر (مثلاً میکائیل اسکاٹ کی بوعلی سینا کی نیچرل ہسٹری) یہ صرف علوم و فنون کی عام تجدید کے بعد تھا کہ عربوں کا سائنس اور فلسفہ لاطینی زبان کی وساطت سے اہلِ تدریس کے علم میں آیا۔ تاہم یہ امر طبعی ہے کہ مسلمانوں کے تنقیفی پہلو نے صلیبیوں پر کوئی اثر پیدا نہیں کیا۔ اس لیے کہ ان کے ہاں مذہبی اشتعال سے قطع نظر سوائے جنگ آزمائی کے اور کوئی مقصد نہیں تھا۔

بارہویں صدی کے وسط میں یورپ میں افواہ اڑی کہ کہیں اسلامی سلطنت کی حدود سے باہر ایک عیسائی نبرد آزما مسمی پیرسٹر جان رہتا ہے جس نے بادیہ نشینوں کو تباہ کن شکست دی ہے۔ اس اہ نے اس امر کی امید دلائی کہ صلیبیوں کو ایک ایسا اتحادی مل گیا ہے جو مخالفین پر دوسری جانب سے حملہ کرے گا۔ مگر اس امید نے عملی جامہ کبھی نہ پہنا اس لیے کہ یہ افواہ مغالطہ پر مبنی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۱۴۱ء میں سلجوقی حکمراں کو ایک ترکی شہزادہ کے ہاتھوں جس کی فوج میں بہت سے عیسائی ترک تھے شکست ہوئی، مگر اُن ترکوں کو صلیبی جنگوں سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ جن کے متعلق بہت ممکن ہے کہ انھیں کبھی کوئی اطلاع نہ ہوئی ہو۔

یہ صرف تیرہویں صدی کے وسط میں مغلوں کا مشرقی یورپ پر حملہ تھا اور اپنے وسط ایشیا کے گھروں میں ان کی فوری واپسی

تھی جس کا نتیجہ مشرق ادنیٰ سے آگے کے ایشیا کا حقیقی انکشاف ہوا، اور جس نے چین کا خشکی کا راستہ کھول دیا۔ اس وقت مشنری پادری لوگوں اور تاجروں نے اس امر کے انکشاف کی خاطر سفر کرنا شروع کیا کہ یہ عجیب و غریب اور ناقابلِ شمار مغل حملہ آور کہاں سے آئے۔ درآنحالیکہ ساتھ ہی انھیں پریسٹر جان سے ملنے کی امید بھی تھی۔ چنانچہ جو بیانات یہ لوگ اپنے ہمراہ لائے، نہایت اشتیاق سے پڑھے جاتے تھے اور ان میں سے سب سے زیادہ مطلع نہیں تو کم از کم سب سے زیادہ معروف مارکو پولو کا بیان ہے۔

مارکو پولو وینس کا شہری تھا جو قبلا خاں کے عہد میں شہر پیکنگ میں پہنچا اور کئی سال تک چین میں اقامت پذیر رہا اور اسی دوران میں مغل شہنشاہ کے زیرِ حکومت اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ بالآخر وہ ایران کی راہ اپنے اصلی وطن کو مراجعت کر گیا۔ جہاں وہ سمندر کے راستے ۱۲۹۹ء میں پہنچا۔

وینس پہنچنے پر مغل لباس میں ملبوس نووارد کو اس کے ہم وطن پہچان نہ سکے۔ یہاں تک کہ اسے خود اپنے مکان میں بدقت داخلہ نصیب ہوا۔ مارکو پولو کے "اسفار" ہمیشہ غیر معمولی ہر دلعزیزی کا باعث بنے رہے ہیں۔ اور چین کے متعلق یورپین استعجاب کی ابتدا بہ مقابلہ کسی دوسری کتاب کے صرف اسی سفرنامہ کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

مگر مشرقی "اسفار" کے متعلق کوئی تصنیف ہر دلعزیزی میں اس کہانی کا مقابلہ نہیں کر سکی جو سر جان منڈیول نے تالیف کی ہے اور جو مارکو پولو کے تقریباً پچاس سال بعد معرضِ وجود میں آئی۔ یہ صحیح ہے کہ اس کتاب کا نفسِ مضمون صرف مشرق ادنیٰ تک محدود ہے۔ مگر یہ وجہ اپنے انتہائی غلو کے اسے مطالعہ کرنے والے پسند کرتے تھے اور صدیوں تک اسے حالات کا حقیقی مرقع خیال کیا جاتا تھا۔ مگر جدید تحقیق کی روشنی میں یہ امر مشکوک ہے کہ آیا منڈیول فلسطین سے آگے بڑھا بھی یا نہیں۔ اور یہ محض اسی نوعیت کی کتابوں کی وجہ سے کہ قدیم نقشہ کاروں کو اس بات کی ترغیب ہوئی کہ وہ ممالکِ غیر منکشفہ کے نقشوں میں خیالی باشندے دکھائیں ـــ ایسے باشندے جن کے دو سر ہوں اور تین ٹانگیں۔ اور علیٰ ہٰذا القیاس، یا اژدہاؤں کے سے خوفناک درندے۔ غلط افواہ کے برقی خرگوشوں پر حقیقت کے سہارے صید افگن کا غلبہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، اور اگر ایسے خرگوش گرفت میں آ بھی جائیں تو خرگوش و سگ ہر دو کو حرمان و یاس اور رنج و الم کا سامنا ہوتا ہے۔ بہر حال اس وقت سے آگے مشرقی "اسفار" کی کتابیں پڑھی جانے لگیں اور پرتگیزوں کی ہندوستان اور ابی سینیا میں ابتدائی پیش قدمیاں بے شمار نفیس و عجیب بیانات کا موجب بنیں۔ چنانچہ ڈاکٹر جانسن کی پہلی شائع شدہ کتاب اب لوبو کے اسفار ابی سینیا کا ترجمہ تھا جس پر بعد میں سیلاس کی کہانی کی تعمیر ہوئی۔

لیکن مشرق کے حقیقی حکایت نامہ کا انکشاف یورپ پر "الف لیلیٰ" کے ترجمہ کی وساطت سے ہوا۔ یہ ترجمہ جس کا اظہار پہلے پہل فرانسیسی میں اور عین بعد انگریزی میں ہوا، بعض کو الف بیں یورپ کے لٹریچر کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ تھا۔

ہمارے لیے جو بچپن سے "ریشِ نیلگوں"، "علی بابا اور چالیس چور" کی حکایت سے مانوس ہیں۔ اس استعجاب کا اندازہ لگانا مشکل ہے جس سے یورپ والوں نے ان مسرت آمیز کہانیوں کا استقبال کیا۔ انھیں کہانیوں نے ان لوگوں کے خلفا، شیوخ، جنات اور عفاریت کی ایک نئی دنیا اور اس قسم کے محلات اور ضیافتوں سے تعارف کرایا جن کا انھیں خواب و خیال تک نہیں تھا۔ ان حکایات نے بغداد اور مصر کو محبت و نفاق اور عجائبات کے کرشموں سے از سرِ نو زندہ کر دکھایا۔

ان حکایات کی عربی اصل کو اول اول ایک فرانسیسی مسمی گیلنڈ نے جو محکمہ سیاسیات کا ملازم تھا دمشق میں پایا، اور

بعد میں ان کا ترجمہ بھی شائع کیا جو متعدد اقساط میں ۱۷۰۴ء اور ۱۷۱۷ء کے مابین اشاعت پذیر ہوا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد لندن میں ایک گمنام انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔ ان حکایات کو فوری کامیابی حاصل ہوئی چنانچہ سرجیمس اسٹیورٹ، اسکاٹ لینڈ کے لارڈ ایڈووکیٹ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک ہفتہ کی شام کو اپنی لڑکیوں کو "الف لیلہ" پڑھتے دیکھا۔ سرجیمس نے ان سے کتاب چھین لی۔ مگر دوسری صبح خود لارڈ ایڈووکیٹ اپنی لائبریری میں اس حالت میں سوئے پائے گئے کہ کتاب اُن کی بغل میں تھی، یعنی یہ کہ وہ اس کتاب کو سبت کے دن طویل عرصہ تک پڑھتے رہے تھے۔

تاہم اس زمانہ تک جب وارن ہیسٹنگز ہندستان کے گورنر جنرل بنے۔ اس سرزمین کی قدیم زبان اور لٹریچر نے مغربی اہلِ علم کی خاص توجہ حاصل نہ کی۔ وارن ہیسٹنگز کا یہ خیال صحیح تھا کہ ہندستانیوں پر انصاف و ہمدردی سے حکومت کرنے کے لیے ان کے اپنے قوانین اور رسوم سے واقفیت حاصل کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ سنسکرت لٹریچر کی تشریح کے بلند پایہ کام کے ضمن میں دو ممتاز نام سر ولیم جونز اور کول برک ہیں۔ سر ولیم جونز تو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا بانی ہے۔ اور کول برک نے سنسکرت کے کئی متون شائع کیے۔ ان انگریز فضلا نے جس کام کی ابتدا کی فرانس اور جرمنی کے فضلا انہماک سے اُس کے درپے ہو گئے۔ اور علم الالسنہ (فلالوجی) کی بنیاد ڈالی گئی۔ تاہم یہ صرف ایف ڈبلیو میکس ملر کتبِ شرقیہ کا ایڈیٹر تھا جس نے عہدِ وکٹوریہ میں سنسکرت لٹریچر اور فلالوجی کی ترویج کی خاطر ہر دوسرے فاضل سے بڑھ چڑھ کر کام کیا۔

جونہی لوگوں نے سنسکرت زبان میں ضبط شدہ لٹریچر کی فراہمی اور مطالعہ کا کام شروع کیا، انکشافات کے وسیع اور جدید میدان کھل گئے، اور مذہب و فلسفہ کے علوم میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ ہمارے لیے یہ امر مشکل ہے کہ ہم اُس اثر کی تشخیص کریں جو یورپ کے فضلا پر ایک قدیم تثقیف و تہذیب کے انکشاف سے مترتب ہوا۔ ایسی تثقیف و تہذیب جس کے وجود کا انھیں علم تک نہیں تھا، جو بلند پایہ ادبی اور فلسفیانہ نوعیت کی بے شمار تصانیف پر مشتمل تھی اور جو اعلیٰ صنف کی شاعری اور ڈراما کے علاوہ، دماغی اور اخلاقی علوم اور فنون و قانون سے متعلقہ وسیع تصانیف پر حاوی تھی۔ چنانچہ بعض پہلوؤں میں اس کی کامیابی یونانیوں کی کامیابی سے حقیقتہً پیش پیش تھی۔

متقابل فلالوجی کا باقاعدہ مطالعہ جس کا حصول سنسکرت کے انکشاف سے ممکن ہو گیا، اُن تمام مروّج نظریوں کے مکمل اعادہ کا موجب بنا جو بنی نوع انسان کی اصل سے متعلق تھے۔ یعنی ایسے نظریے جو اس وقت تک شہر بابل میں اختلاف السنہ کے افسانہ پر مبنی تھے۔ اس طرح پر مشرق نے، جس نے خود کو مغرب پر اس تہل سے منکشف کیا، آخر الامر اپنے سب سے گراں مایہ راز یعنی ہندستان کو عیاں کیا۔

ایک هندو فارسی گو شاعر

منشی کیولا پرشاد فقیر

رضوان اللہ آروی

ثنا خوانِ علی مرتضایم　　مشرفِ بارگاهِ مصطفایم
اگرچه کفر باشد شیوهٔ من　　مگر مقبولِ درگاهِ خدایم　(فقیر)

بارہویں اور پھر تیرہویں صدی ہجری کا دور بہار میں فارسی ادبیات کا عالمِ شباب ہے۔ بالخصوص فارسی شاعری بہار کی مختلف خانقاہوں کی بدولت بے حد مقبول ہو چکی تھی۔ بلکہ احمد اللہ ندوی کے یہ قول: "بہار میں فارسی شاعری کا وجود ہی خانقاہوں کی بدولت ہوا"[1] اس میں دو رائے نہیں کہ بہار میں فارسی شاعری کو عام کرنے میں خانقاہوں کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ یہی وہ زریں دور ہے جب سرزمینِ بہار نے حضرت ابوالحسن فرد (صاحبِ سجادہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف) جیسا شاعر پیدا کیا جس کی غزل خوانی سے "بلبل آمد بفغان" اور "گل زگریباں بگذشت" اور جنھیں مولانا سعید حسرت عظیم آبادی نے اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا:۔

در زمینِ ہند حسرت بعد خسرو ہمچو فرد　　در گماں مانشہ پیدا غزل خوانے دگر

حضرت فرد کے علاوہ اس دور میں جو صاحبِ سجادہ فارسی شاعری کے گیسوئے تابدار کو اور تابدار کر رہے تھے ان میں شاہ نورالحق تپاں خانقاہ عمادیہ، شاہ احسان اللہ احسان خانقاہ مخدوم فرید بخش، شاہ امین احمد شوق خانقاہ مخدوم الملک بہار شریف، شاہ عطا حسین فانی خانقاہ منعمیہ ابوالعلائیہ پٹنہ، گیا۔ خاص طور پر لائقِ ذکر ہیں۔

مختلف خانقاہوں سے اٹھنے والی ان مسلسل صداؤں سے اپنوں کے ساتھ ساتھ برادرانِ وطن بھی زیادہ دیر تک خود کو الگ نہ رکھ سکے۔ بالخصوص ان میں جو موزوں طبیعت کے حامل تھے۔ ان کے سمندِ شوق پر یہ آوازیں ایک تازیانہ ہوئیں۔ چنانچہ انھوں نے بھی ان کی آوازوں سے آوازیں ملانا شروع کر دیں۔ اور ابھی زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی کہ ہندو فارسی گو شعرا کا ایک پورا قافلہ تیار ہو چکا تھا اور بہار کی فضاؤں میں ان کی آوازیں رچ بس چکی تھیں اور بجا طور پر وہ لوگ یہ دعویٰ کرنے کے قابل ہو چکے

---

[1] تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔ حصہ اول دیباچہ

تھے کہ ع اپنا لہو بھی سُرخیٔ شام و سحر میں ہے

اس دور کے ہندو شاعروں کے اس کارواں میں نند لال گویا، اجاگر چند الفت، لالہ رام چند فرحت، راجہ پیارے لال اُلفتی، اور راجہ رام نرائن موزوں کا ذکر تذکروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ تاہم موزوں ہی کے خانوادے کا ایک صوفی منش شاعر منشی کیولا پرشاد متخلص بہ فقیر ایک ایسا شاعر ہے جس کے متعلق فصیح الدین بلخی کے علاوہ تمام تذکرہ نگار خاموش ہیں۔ منشی کیولا پرشاد فقیر مظفر پور کے رہنے والے تھے، جو اس زمانے میں ایک قصبہ ہوا کرتا تھا۔ افسوس ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود مجھے ان کے سنہ پیدائش و وفات معلوم نہ ہو سکے۔ البتہ آثار و قرائن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۲۸۶ھ تک زندہ رہے۔ اب اس وقت ان کی عمر کیا تھی؟ یہ کہنا تو مشکل ہے تاہم اس وقت کا ان کا کلام ان کی کہولت کا پتہ دیتا ہے۔ اور اس کی تائید مزید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ جناب فصیح الدین بلخی نے اپنے تذکرے میں جناب فقیر کو اُن "متوسطین ہندو شعرائے بہار" میں جگہ دی ہے، جو تیرہویں صدی ہجری میں مشق سخن کرتے تھے ـــــ جناب فقیر کی تعلیم و تربیت کا حال بھی پردۂ خفا میں ہے۔ تاہم اُن کا پختہ کلام اس بات کا بین ثبوت ہے کہ منشی کیولا پرشاد فقیر فارسی کے علاوہ عربی زبان پر بھی پوری دسترس رکھتے تھے۔ فصیح الدین بلخی لکھتے ہیں:

"منشی کیولا پرشاد ساکن مظفر پور ـــ بڑے ذی علم شاعر و ادیب اور خوشنویس تھے۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔"[1]

ان کی عقیدت کے ذیل میں خاص طور پر ان کی خوشنویسی کا ذکر بھی آتا ہے۔ اِس فن پر عبور کامل رکھنے کی وجہ سے وہ "خورشید رقمی" کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کے دستِ خاص کی لکھی ہوئی ایک رباعی کی خوبصورتی کا قصہ فصیح الدین بلخی کی زبانی سنیے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک رباعی اس قدر خوبصورت نستعلیق میں لکھی ہوئی ہے کہ اگر یاقوت زندہ ہوتا تو اس کی پوری داد مل سکتی تھی۔ دیکھنے والوں کا اس صفحہ سے نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا۔"[2]

اور وہ رباعی یہ ہے:

اے کشور عیش زیر فرمان تو بار — برخلق وجہان ہمیشہ احسان تو بار
ذات تو مقدس است و مقبول جہاں — ایں عید و ہزار عید قربان تو بار

(بندۂ عقیدت کیولا پرشاد خورشید رقمی)

مشاعرے میں جناب فقیر کو داروغہ سید مبارک علی طالب (ایک غیر معروف شاعر) سے تلمذ حاصل تھا جن کی کئی غزلیں دیوانِ فقیر میں شامل ہیں ـــــ جناب فقیر کی سوانح کا واحد ذریعہ ان کی ایک اردو مثنوی ہے جس سے ان کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کے بعض اشعار اس بات کی طرف اشارہ کناں ہیں کہ منشی کیولا پرشاد، راجہ رام نرائن موزوں کی اولاد میں تھے۔ وہ کہتے ہیں: ــــ

میں احوال اپنا لکھوں مختصر — نہیں کذب کا اس میں کچھ ہے اثر
کہ تھے از بزرگانِ من رنگ لال — دو فرزند اُن کو لکھوں اُن کا حال

---

[1] تذکرہ ہندو شعرائے بہار ص: ۴۹ [2] ایضاً ص: ۱۵۱

(یہاں دو فرزندوں سے مُراد رام نراین اور ان کے بھائی دھیرج نراین ہیں)

منشی کیولا پرشاد کے اشعار میں جناب فصیح الدین بلخی نے ایک اردو دیوان قلمی، ایک اردو مثنوی اور چند قلمی وصلیوں کا ذکر کیا ہے۔ جو انھیں سید شاہ تقی حسن بلخی کے کتب خانے سے دستیاب ہوئے تھے۔ لیکن حیرت ہے کہ ان کی نگاہ سے فقیرؔ کا ایک مطبوعہ فارسی دیوان مخفی رہ گیا — !!!

فصیح الدین بلخی نے اپنا تذکرہ جولائی ۱۹۶۱ء میں مکمل کیا ہے جبکہ فقیرؔ کا فارسی دیوان ۱۸۷۲ء کے آس پاس مطبع متھلا مظفر پور سے شائع ہو چکا تھا جس کا واحد نسخہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ سرورق کی اس عبارت سے دیوان کا مختصر صوری تعارف ہو جاتا ہے:

"من تصنیفات شاعرِ شیریں مقال عاشق زار حیدر کرار منشی کیولا پرشاد صاحب خورشید رقمی کتاب
لاجواب مسمی بہ دیوانِ فقیرؔ معروف بہ عاقبت بخیر حسب فرمائش شیخ بہرام علی صاحب طالب العلم بہ مطبع متھلا
واقع قصبہ مظفر پور رونقِ طبع یافت۔"

دیوان کا کاتب فتح محمد نامی ایک شخص ہے جو خود کو جناب فقیرؔ کا شاگرد کہتا ہے۔ دیوان کی طباعت ۱۸۷۲ء کے قریب عمل میں آئی ہے جیسا کہ آخری صفحہ کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے:

"کاتب فتح محمد، شاگرد مصنّف رسالہ ہذا ۳۱ر دسمبر ۱۸۷۲ء"

اور یہیں ایک دلچسپ انکشاف بے محل نہ ہوگا۔ خدا بخش لائبریری کے فہرست ساز نے سنہ طباعت کے خانہ میں دیوان فقیرؔ کا سنہ طباعت ۱۸۷۱ء لکھا ہے۔ لیکن یہ ایک مغالطہ ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ آرہ کے ایک نامور حکیم قمر الدین حسین صاحب کی وفات ۱۸۷۱ء میں ہوئی۔ جناب فقیرؔ نے ان کی تاریخِ وفات اس شعر سے نکالی:

ازسرِ چرخِ چہارم درگزشت　　شمس طب کردہ غروب ای آہ آہ
۱۸۷۱ء

مصرع ثانی کے نیچے ۱۸۷۱ء لکھا ہے اور ٹھیک اس کے نیچے یہ عبارت درج ہے:

"بہ مطبع متھلا دھرم اودے مظفر پور باہتمام اما شنکر کے چھاپی گئی۔"

اس عبارت پر دیوان ختم ہو جاتا ہے۔ ۱۸۷۱ء سے اس دیوان کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ حکیم قمر الدین حسین کا سنہ وفات ہے نہ کہ دیوان کا سنہ طباعت!

جناب فقیرؔ کا یہ منفرد دیوان صرف حضرت علی کی منقبت پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اس میں تنوع کی تلاش بے سود ہوگی۔ مجھے یاد آتا ہے حضرت فردؔ پھلواروی کے قابلِ فخر صاحبزادے حضرت علی حبیب نصرؔ کے مجموعہ کلام "دیوان معجز بیان" کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر کلیم رضوی برقؔ نے اپنے کسی مقالہ میں فرمایا تھا کہ یہ فارسی کا منحصر بہ فرد دیوان ہے جو صرف نعتِ رسولؐ پر مشتمل ہے۔ ٹھیک اسی طرح دیوانِ فقیرؔ کے علاوہ کوئی بھی ایسا دیوان میری نظر سے نہیں گزرا جو صرف حضرت علی کی منقبت پر مشتمل ہو۔ تاہم جس طرح حضرت نصرؔ کے دیوان میں نعت کے علاوہ چند منقبتیں بھی شامل کی جاتی ہیں۔ اسی طرح دیوان فقیرؔ میں منقبت کے علاوہ چند نعتیں بھی جلوہ نما نظر آتی ہیں۔ ذاتِ رسالت مآبؐ سے جناب فقیرؔ کی جذباتی وابستگی کا ثبوت دیوان کا پہلا ورق الٹتے ہی مل جاتا ہے۔ دیوان کے آغاز میں ہی لفظ بسم اللہ کے فوراً بعد درود شریف دیکھ کر "بعد از خدا بزرگ توئی" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اُن کی نعت کا ہر شعر اُن کے جذبۂ خلوص کا عکاس اور اُن کی والہانہ عقیدت کا مظہر ہے:

یا شفیعِ عاصیاں یا پیشوا اے انبیاء　　یا محمد مصطفیٰ محبوبِ ذاتِ کبریا
ہر دو عالم سر بسر مشکورِ فیضِ عامِ تو　　فیض بخشِ دو جہان و دستگیر اتقیاء
در دارد نام تو یا رحمۃً للعالمین　　این گدای مضطر و عاجز فقیرِ بے نوا

اور آنحضورؐ کے تئیں اُن کا جذبۂ عقیدت جب مزید نکھرا تو حیرت انگیز طور پر وہ ٹوٹ کر بکھر گئے۔ معلوم ہوتا ہے اب وہ اس حقیقت کا سراغ پا چکے تھے کہ یہی وہ "ادب گاہ" ہے جو زیرِ آسمان عرش سے بھی نازک تر ہے۔ لہٰذا یہاں ٹوٹے ہوئے دل اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ہی آنا چاہیے۔ دیکھیے کتنی بے بسی کے ساتھ فریاد کناں ہیں۔ ؎

سرِ بارِ گراں دارم اغثنی یا رسول اللہؐ　　تحمل زاں نمی دارم اغثنی یا رسول اللہؐ
شفیعِ عاصیاں ہستی شفیع المذنبیں نامت　　خداوندا گنہگارم اغثنی یا رسول اللہؐ
فقیرِ بے نوا خواند بایمان و یقیں از دل　　توی شاہا مددگارم اغثنی یا رسول اللہؐ

تاہم میری نگاہ میں ذاتِ رسولؐ سے ان کی عقیدت کا اصل شناسنامہ اُن کا وہ ہفت بند نعت شریف ہے جو انھوں نے ۱۲۸۶ھ میں مظفر پور میں قلم بند کیا۔ اور جس کا پہلا بند فصیح الدین بلخی صاحب نے اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے۔ یہ معرکۃ الآرا نعت ان کے دیوان میں شامل نہیں۔ فصیح الدین بلخی کی تحریر کے مطابق یہ کلام انھیں خانقاہ فتوح کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا جس کے صفحۂ اوّل پر یہ عبارت درج ہے: "بہ عنایت الٰہی ہفت بند نعت شریف فقیرِ عاصی کیولا پرشاد خورشید رقمی طبع زاد خود بہ قصبہ مظفر پور قلمی نمود۔ ۱۲۸۶ھ"

پہلے بند سے چند اشعار ملاحظہ فرمایے اور اس کافر کی صوفیانہ شان پر قربان جایے: ؎

السلام اے فیضِ ذاتت باعثِ دنیٰ و دیں　　السلام اے ذات پاکت رحمۃ للعالمین
السلام اے بارگاہت بارگاہِ کبریا　　السلام اے آستانت مہبطِ روح الامین
از طفیلِ خیرِ تو معمور شد شش از جہاں　　خود خدا فرمود در شانِ تو خیر المرسلین
ورد دارد ہر نفس شاہا فقیرِ بے نوا　　یا محمد مصطفیٰ و یا علی مرتضیٰ

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا جناب فقیرؔ کا اصل کارنامہ حضرت علی کی منقبت ہے جس سے ان کا سارا دیوان بھرا پڑا ہے۔ مجموعی طور پر ان کے دیوان میں ۱۳۲ غزلیں ہیں جن میں سے بیشتر غزلیں پانچ شعروں پر مشتمل ہیں۔ سات غزلیں ان کے علاوہ ہیں جو دوسرے شعرا کی ہیں۔ غزلوں کی ترتیب ردیف وار حروفِ تہجّی کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اٹھاون ۵۸ رباعیات بھی اس دیوان کی زینت ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ چند ایک غزلوں سے قطع نظر تمام غزلیات و رباعیات کا عنوان "یا علی مدد" رکھا گیا ہے۔ اس عنوان سے جناب فقیرؔ کے عاشقِ زارِ حیدرِ کرار ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے ـــــ لیکن ایک رنگ میں ہونے کے باوجود جناب فقیرؔ کا دیوان دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک مضمون میں پورا دیوان تیار کر دینا اور آخر تک دلچسپی برقرار رکھنا آسان کام نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں یہ جناب امیرؑ کے عشق کا اعجاز ہے کہ جناب فقیرؔ کے اس "یک رنگے" دیوان میں "دھنک رنگ" کی سی کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ دیوان کی پہلی غزل دیوانِ حافظ کی پہلی غزل کی زمین میں ہے۔ جناب امیرؑ کی شان میں جناب فقیرؔ کہتے ہیں: ؎

شود آساں ز نامِ تو جہاں را جملہ مشکلہا　　یقینِ فیضِ عامِ تو جہ افتاد است در دلہا

بہ بحرِ عشق غوّاصم، تموّج دام از مستی — تمید انند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا
بہ عشقِ مرتضیٰ مستم فقیرِ بیریا ہستم — دلم گوید پی دنیہ کہ امہل ثمّ امہلہا

اسی طرح حافظ کی ایک دوسری غزل "غلامِ نرگسِ مستِ تو تاجدار انند" کی زمین میں جناب فقیر کی یہ منقبت بھی ایک خاص کیف کی حامل ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ؎

غلامِ سرورِ کونین تاجدار انند — فدای حضرتِ حسنین شہریار انند
بہشت خلد مقام است خادمانِ علی — کہ خادمانِ علی خاص دوست دار انند
ہزار شکرِ خدا می کند فقیرِ گدا — کہ دوستانِ علی جملہ کامگار انند

جس دل میں حُبِّ علی نہ ہو اُسے جناب فقیر زجاج سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے: ؎

گوہر است الا اگر حُبِّ تو نیست — بے گمان دانیم او را چون زجاج

اور کیوں نہ ہو جب تکمیل ایمان کی شرط ہی حُبِّ علی ٹھہری۔ فقیر ہی کا شعر ہے: ؎

باعثِ تکمیلِ ایمان حُبِّ تو — والیٔ اسلام و ایمان الغیاث

جناب فقیر کو شیعہ تو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیے کہ بہ قول خود وہ "برون از اسلام" ہیں۔ تاہم شیعہ عقائد سے وہ انتہائی متاثر نظر آتے ہیں اور حضرت علی کی مدح و توصیف میں وہ غلو کی حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اُن کے اس مزاج کو سمجھنے میں اُن کی یہ رباعی ہماری بڑی مدد کرتی ہے: ؎

علی شیرِ خدا و یا دا و مشکل کشائی من — علی مرتضیٰ و دردِ عشق او دو ائے من
برون از کفر و اسلام نہ شیعہ ام نہ سنّی ام — علی را من خدا خوانم علی باشد خدائے من

اس کی روشنی میں جب ہم ان مبالغہ آمیز اشعار کو دیکھتے ہیں تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا: ؎

بناشد مومناں را اندریں شک — بود قرآں کلامِ شاہِ مرداں
نبوت را ز ذاتت فیض و فخر است — زنامت نورِ ایماں آفریدند

گمان غالب ہے کہ جناب فقیر کی اس انتہا پسندی کی وجہ سے اُن کے مخالفین کا ایک گروہ اُن کے درپے ہوگا۔ جناب فقیر کھل کر اس کا اعتراف تو نہیں کرتے تاہم اُن کے بعض اشعار سے اس کا اشارہ ملتا ہے، مثلاً ؎

از جفای ناسزایاں خاطرم صدپارہ شد — دور کن از خاطرم رنج و محن یا بوتراب
از فرس پامال فرما دشمنم را ہم چو فرش — ایں خرِ عیسیٰ است ناحق درپے آزارِ ما

کاش، اس "خرِ عیسیٰ" کا پتہ چلتا تو بہت سی دل چسپ باتیں سامنے آتیں۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ دیوان فقیر میں ایسی انتہا پسندی کی مثال آٹے میں نمک کی سی ہے۔ عمومی طور پر حضرت علی کی مدح سرائی انھوں نے بڑے مثبت انداز میں کی ہے۔ وہ جداگانہ انداز سے بارگاہِ علیؓ میں حاضر ہوتے ہیں اور مختلف انداز و آہنگ سے اپنی غلامی کا اعتراف اور اپنی وفاداری کا اقرار کرتے ہیں ــــ چوں کہ ان ساری غزلوں کا موضوع ایک ہی

ہے صرف طرز اظہار میں فرق ہے اسلیے میں بغیر کسی تبصرہ کے مختلف غزلوں سے متفرق اشعار پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ آپ اس "گلستان سہ پوری" "بہار" کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

جان نثارم بر علامت یا علی مرتضیٰ — ہر نفس ورد است نامت یا علی مرتضیٰ
ایں فقیر بے نو ممنون احسانت مدام — مستفیض فیض عامت یا علی مرتضیٰ

بر حال ما نظر کن شیر خدا خدایا — شاہا عجب چہ باشد سلطاں کنی گدارا
در ظاہری فقیرم در باطنی امیرم — مولاست دستگیرم ہیچ است دور دارا

ذرہ ام لیکن ز مہر بو تراب — آفتابم آفتابم آفتاب
ایں فقیر بے نوا از دور چرخ — چند باشد یا علی زار و خراب

بجز مدح علی کارم نباشد — ز نام کس سرو کارم نباشد
ز خاک پائے شاہ بو ترابم — زمیں را نیز آزارم نباشد

زکویت باغ رضواں آفریدند — ز مویت سنبلستان آفریدند
نبوت راز ذاتت فیض و فخر است — ز نامت نور ایماں آفریدند
چساں من شکر ایں نعمت گزارم — کہ مارا منقبت خواں آفریدند

یا شاہ دیں پناہ شود عاقبت بخیر — از لطف یک نگاہ شود عاقبت بخیر

یکی از خادمان خادمانم — بہ مدح مرتضیٰ رطب اللسانم
فزاید روح از فیضان نامش — بہ ذکر مرتضیٰ بس شادمانم
ز فیض حضرت والا بہ عالم — فقیر حیدری نام و نشانم

عرش ہم بالا نباشد ز آستانت یا علی — عرش و کرسی ہست قربان مکانت یا علی
آرزو دارند ہر جن و بشر حور و ملک — بر در دولت شوم از خادمانت یا علی
ایں فقیر ناتواں راہست امید قوی — از طفیل فیض عام کامرانت یا علی

ان اشعار کے تناظر میں جناب فقیر کی یہ تعلّی گراں نہیں گزرتی۔ اپنی ایک اردو رباعی میں مستانہ وار وہ کہتے ہیں:۔

ہے نقل ہفت بند وظیفہ فقیر کا — منشی ہوں پائے تخت جناب امیر کا

مولانے وہ عمر دے دیا اس فقیر کو　　　چکرا رہا ہے ہوش فلک پہ دبیر کا

جناب امیر کے علاوہ جناب فقیر نے خاص طور پر دو اور بزرگوں کی مدح خوانی کی ہے ان میں ایک حضرت سیدنا امیر ابوالعلا قدس سرہٗ ہیں جو سلسلۂ ابوالعلائیہ کے بانی ہیں۔ اور دوسرے حضرت شاہ منیر، عرف شاہ منیری علیہ الرحمۃ ہیں جو اس سلسلہ کے نامور پیر طریقت رہے ہیں۔

حضرت امیر ابوالعلا کا وصال ۱۰۶۱ھ میں ہوا۔ اور وہ آگرہ میں مدفون ہوئے ــــ ان حالات کی روشنی میں جناب فقیر کے ان اشعار کو سمجھنا اب زیادہ آسان ہوگا جو انھوں نے حضرت امیر ابوالعلا کی مدح میں کہے ہیں: ؎

جلوۂ نورِ خدا یا ابوالعلا یا ابوالعلا　　　نورِ عینِ مصطفیٰ یا ابوالعلا یا ابوالعلا

حامیٔ دینِ محمدؐ جانشینِ مرتضیٰ　　　قدرتِ دستِ قضا یا ابوالعلا یا ابوالعلا

از قدومت آگرہ شد رونقِ ہندوستاں　　　چوں بنا شد جاں فزا یا ابوالعلا یا ابوالعلا

ورد میدارد بنامت ہر نفس شام و سحر　　　ایں فقیرِ بے نوا یا ابوالعلا یا ابوالعلا

دوسرے بزرگ جیسا کہ میں نے عرض کیا، حضرت شاہ منیر عرف شاہ منیری علیہ الرحمۃ ہیں جو حضرت مخدوم منعم پاک قدس سرہٗ کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کے حالات میں عطا حسین فانی نے یہ چند سطور لکھنے پر اکتفا کی ہے: ؎

"شاہ منیری علیہ الرحمۃ متوطن علاقہ بہار در مجلس حضرت قطب العلم (لقب حضرت مخدوم منعم پاک) حاضر شاہ یکے از معتقدان گشتہ شرف بیعت حصول نمودند بعدہٗ در صحبت عالیہ ماندہ از توجہ و تعلیم، مراقبہ و اذکار۔ تربیت یافتہ مشرف بخلافت گردیدہ بہ یاران۔ تربیت می نمودند از سال و ماہِ وصال ایشاں مطلع نیست"[1]

ان کی شان میں جناب فقیر فرماتے ہیں: ؎

ایں ہند مستفیض ز فیض بہار شد　　　از حضرتِ منیر ہمہ پُر بہار شد

جن و بشر طواف کنند ایں مقام را　　　ہندوستاں اشرفی از بہار شد

فیاضیٔ بہار فزوں از خیال خلق　　　از حضرتِ بہار جہاں کامگار شد

دیوان کے آخر میں چند قطعاتِ تاریخ ہیں۔ پہلا قطعہ شاہ امام علی صاحب مرحوم قدس سرہٗ، برادر بزرگ حضرت مولوی امداد علی صاحب خان بہادر کے لیے ہے جنھیں جناب فقیر اپنا مرشد کہتے ہیں۔ یہ چار اشعار کا قطعہ اس اعتبار سے ندرت کا حامل ہے کہ اس کے ہر شعر کے پہلے حرف سے تاریخ نکالی گئی ہے: ؎

راہِ جنّت گرفت مُرشدِ من　　　مستفیضِ فیوض لم یزلی

عزتِ مہر و ماہ بودِ رخش　　　اسم او سیّد امام علی

فکرِ تاریخ آں چو کرد فقیر　　　گفت ہاتف بصد خلوص دلی

حرفِ اول بگیر از ہر شعر　　　جملہ تاریخ شد بہ طرزِ جلی

۱۲۸۵ھ

---

[1] کیفیت العارفین : ص: ۱۳۰

اس کے بعد بالترتیب شیخ راحت علی قاضی پوری اور مولوی عبدالعزیز بکھروی کے قطعات تاریخ ہیں۔ مولوی عبدالعزیز بکھروی مرحوم کے قطعۂ تاریخ میں جناب فقیرؔ نے ایک عجیب شعر کہا ہے: ؎

دمی جو الپسیں یا علی گفت و مُرد　　　زہی اعتقادات عبدالعزیز

پھر آرہ کے ایک رئیس اور مشہور حکیم جناب قمرالدین حسین کے لیے تین قطعاتِ تاریخ ہیں۔ ایک اردو میں اور دو فارسی میں۔ آخر میں لالہ امرت لال نامی ایک شخص کا قطعۂ تاریخ ہے۔ ان کی ذات سے متعلق جناب فقیرؔ نے کوئی صراحت نہیں کی۔ تاہم لفظ "عزیز دلم" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کے فرزند تھے۔ کہتے ہیں: ؎

از جہاں رفت چوں عزیز دلم　　　نام او بود لالہ امرت لال الخ

مجموعی طور پر بہ لحاظ کمیت دیوان فقیرؔ شاید قابلِ اعتنا نہ ٹھہرے، تاہم کیفیت کے اعتبار سے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک پورے دیوان کا صرف حضرت علی کی منقبت پر مشتمل ہونا بجائے خود ادبی دنیا کا ایک اہم اور نادر واقعہ ہے اور اس پر مستزاد صاحب دیوان کا غیر مسلم ہونا ـــــ اور ہمارے لیے خاص طور پر یہ بات باعثِ افتخار ہے کہ یہ اعزاز سب سے پہلے ہمارے صوبہ کو حاصل ہوا۔ لہٰذا ان حقائق کے تناظر میں منشی کیولا پرشاد فقیرؔ کے اس دیوان کو بہار کی "اوّلیات" میں شمار کرنا چاہیے۔

اردو کے عظیم شاعر میرؔ کے بارے میں ایک اہم تحقیقی و تنقیدی کتاب

محمد تقی میر

مصنفہ

ڈاکٹر جمیل جالبی

قیمت: پچیس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان - بابائے اردو روڈ - کراچی نمبر ۱

لفظ "کر" کی حقیقت

ڈاکٹر سہیل بخاری

اردو زبان کا یہ لفظ جو تین بنیادی آوازوں کاف، زبر اور رے کے ملنے سے تیار ہوا ہے، بہ ظاہر ایک نظر آتا ہے۔ لیکن یہ ایک نہیں ہے۔ بلکہ ایک سے زیادہ الفاظ کا ہم صوت اور ہم صورت ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ ہمارے مندرجہ ذیل مختلف گرامری حیثیتوں میں بولا جاتا ہے:

۱۔ یہ اپنی پہلی حیثیت میں ایک فعل کا ابتدائی یا بنیادی مادہ ہے جسے ہم امر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے کتنے ہی معنی ہوتے ہیں۔ بنا۔ عمل میں لا۔ انجام کو پہنچا۔ چلا۔ فروغ دے وغیرہ جیسے باتیں مت کر۔ دوکان کر۔ سودا کر۔ سیر کر وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مصدر بھی ہے۔ کیوں کہ اس پر مختلف لاحقوں کے اضافے کے مختلف فعلی روپ کرتا (کر + تا) کر رہا (کر + رہا) کراتا (کرا + تا) کرنا (کر + نا) وغیرہ تیار، مشتق یا صادر ہوتے یا نکلتے ہیں۔

امر کی ہی حیثیت سے یہ کسی اسم پر اضافے کے بعد مرکب کو اسم فاعل بنا دیتا ہے۔ اور "کرنے والا" کے معنی دیتا ہے جیسے۔ دن کر (دن + کر یعنی دن کرنے والا، سورج) پربھاکر (پربھا، بمعنی روشنی + کر یعنی روشن کرنے والا، سورج) وغیرہ

۲۔ اسم کی حیثیت سے یہ ایک دوسرا ہی لفظ ہے جس کے مندرجہ ذیل معنی نکلتے ہیں۔

(ا) ٹیکس، محصول جیسے جل کر (پانی کا محصول، آبیانہ)

(ب) کمر، چنانچہ کروٹ کے معنی ہیں کر (کمر) + وٹ (بٹ بل) یعنی کمر کا پہلو۔

(ج) عادت، جیسے عرفان رضا کو کھانے کے بعد قیلولہ کرنے کی کر ہو گئی ہے۔ اس کا بہروپ "کل" بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے مجھے اپنے ہی گھر کی کل پڑ گئی ہے۔ میں سفر پہ نہیں جا سکتا۔

(د) سختی، اس سے کرّا، کرکرا اور کرارا جیسے الفاظ بنتے ہیں۔ اس کا بہروپ "کرڑ" ہے۔

۳۔ متعلق فعل کی حیثیت سے یہ ایک تیسرا لفظ ہے جس کے کئی معنی ہیں اور کئی بہروپ بولے جاتے ہیں:

(ا) فعلی مادے پر لگ کر طریقہ، وضع، ڈھنگ اور حالت کے معنی دیتا ہے اور حالیہ ناتمام بناتا ہے۔ جیسے: ہنس کر بولو (ہنستے ہوئے بولو) میرے پاس ہو کر جانا (میرے پاس ہوتے جانا) بچ کر نکلو (بچتے ہوئے نکلو) جان بوجھ کر جھوٹ

مت بولو (جانتے بوجھتے جھوٹ مت بولو) ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرو (ہاتھ پاؤں بچاتے ہوئے کام کرو) وغیرہ۔

اس کا بدل "کے" (کاف، زبر، بڑی یے) ہے۔ اسے "کر" "کے" اور "کر کے" بھی بولتے ہیں۔ جیسے: بچ کر نکلو۔ بچ کے نکلو۔ بچ کر کے نکلو۔

(ب) فعلی مادے پر لگ کر صفت کے معنی دیتا اور حالیہ تمام بناتا ہے جیسے:

یہ اس سے بھی بڑھ کر ہے (یہ اس سے بھی بڑھا ہوا ہے) ہم تم سے گھٹ کر نہیں رہیں گے (ہم تم سے گھٹے ہوئے نہیں رہیں گے) پھٹکر (پھوٹا ہوا، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر، پھوٹ کر۔)

اس کا بدل کَے (کاف، زبر، بڑی یے) ہے۔ اسے کَر، کَے اور کر کے تینوں طرح بولتے ہیں۔ جیسے:

بڑھ کر بولی بولو۔ بڑھ کے بولی بولو۔ بڑھ کر کے بولی بولو۔

(ج) فعلی مادے پر لگ کر "کے بعد" کے معنی دیتا ہے۔ جیسے:

بادل برس کر کھُل گئے۔ (بادل برسنے کے بعد کھُل گئے) کھانا کھا کر جانا (کھانا کھانے کے بعد جانا)

اس کا بدل "پر" ہے جیسے:

مچھلی کھا کر دودھ مت پینا۔ (مچھلی کھانے پر دودھ مت پینا)

اسے "کَے" اور "کَر کے" بھی بولتے ہیں۔ جیسے: کھانا کھا کر جانا۔ کھانا کھا کے جانا۔

(د) اسم کے بعد آتا ہے اور "سے" کے معنی دیتا ہے۔ جیسے:

وہ اس معنی کر ہمارا رب ہے کہ ہمیں روزی دیتا ہے۔ وہ اس وجہ کر پریشان ہے کہ اس کی آمدنی کم ہے۔

لیکن اردو کے معیاری محاورے میں اس طرح نہیں بولتے۔

(ہ) اسم کے بعد آتا ہے اور "کی حیثیت سے"، "کے نام سے"، "کی ترتیب سے"، "کے حساب سے"، کے معنی دیتا ہے اور کر، کر کر یا کر کے۔ تینوں طرح بولا جاتا ہے۔ جیسے:

وہ ہمارا دوست کر کے کام سے بچ گیا۔ احمد نواب کا بھائی کر کے یا کر کر مشہور ہے۔ وہ محلہ حکیماں کر مشہور تھا۔ وہ محلہ حکیماں کر کر یا کر کے مشہور تھا۔ وہ محلے بھر میں چور کر کے مشہور تھا۔ نوٹ ایک ایک کر کے گنوں۔ بوند بوند کر کے تالاب بھر جاتے ہیں۔ کھیل کے میدان میں کھلاڑی دو دو کر کے داخل ہوئے۔

(و) صفت اور دوسرے متعلق فعل کے ساتھ "طور سے"، "طرح سے"، "طریقے سے"، کے معنی دیتا ہے۔ جیسے:

گرم گرم کھانا خاص کر جاڑوں میں اچھا لگتا ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کی شادی میں اس کے دوست کو خاص کر کے بلایا تھا۔

؎ جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر — میں بہت کر کے اس کی ہزار روپے سے مدد کر سکتا ہوں۔

غرض اردو میں "کر"، ایک نہیں تین ہم صورت اور ہم صوت الفاظ ہیں۔ ایک فعل دوسرا اسم اور تمیز متعلق فعل۔ اور متعلق فعل "کر"، کے، کر کر اور کر کے، کے روپوں میں بھی بولا جاتا ہے۔ کر کا بہروپ "پر"، بھی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح "پر"، کے بہروپ "کر"، "پے" اور "پہ"، ہیں۔

شاعری اور فکشن — قربتیں اور فاصلے

ڈاکٹر فہیم اعظمی

آج کل ہم جب فکشن کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد نثر میں لکھی ہوئی کہانیوں سے ہوتی ہے۔ چاہے افسانے کی شکل میں یا ناول کی شکل میں۔ اسی طرح جب ہم لفظ بیانیہ استعمال کرتے ہیں تو ہماری مراد نثر میں لکھی ہوئی روایاتی اور غیر تجریدی اسلوب کی کہانیوں سے ہوتی ہے لیکن ادب کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بیانیہ اور فکشن یہ دونوں الفاظ صرف افسانے ناول یا نثری صنف کی دوسری کہانیوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ نظم بھی بیانیہ اور فکشن کہلائی جاسکتی ہیں۔ یونانی دور کی ایپک پوئٹری (EPIC POETRY) کو ارسطو نے بھی بیانیہ نظم کہا ہے۔ ایسی نظم کے بارے میں جو سوائے اسلوب کے باقی تمام صفتوں میں کہانی ہوتی تھی۔ ارسطو کہتا ہے:

> "جہاں تک بیانیہ نظم میں نمائندگی (REPRESENTATION) کے فن کا تعلق ہے ٹریجیڈی کی طرح اس کا پلاٹ بھی ڈرامے کی طرح کا ہونا چاہیئے۔ اسے وحدت عمل پر مرتکز ہونا چاہیئے۔ ساری کی ساری اور مکمل۔ اس میں ابتداء، درمیانہ اور انتہا کا انداز ہونا چاہیئے تاکہ مکمل اور واحد نظام کی حامل یہ نظم ایک خاص قسم کی لذت پیدا کر سکے۔"[1]

ایسے ہی قصوں کو جو داستانوں کے زمرے میں آتے ہیں ہم ادب میں شعری فکشن کا نام بھی دیتے آئے ہیں۔ ان میں زمانۂ قدیم کی مشرق اور مغرب کی کہانیاں اور داستانیں شامل ہیں جن میں ساری کی ساری کہانی ایک ہیرو کے گرد گھومتی ہے۔ ہومر کی الیڈ (ILIAD)، ریناسنس (RENNAISANCE) کے دور کی رومانی شعری کہانیاں جیسے آرتھر کے قصے، چوسر (CHAUCER) کی ٹرائلس (TROILUS) اور کینٹربری ٹیلس (CANTERBURY TALES) ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ (PARADISE LOST) وغیرہ شعری فکشن یا بقول ارسطو بیانیہ نظموں کی مثالیں ہیں۔ اردو ادب میں ایسی شعری فکشن یا بیانیہ نظموں کی مثالیں وارث شاہ کی ہیر، افضل شاہ کی سوہنی ماہیوال، مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق اور دوسری داستانیں اور مثنویاں ہیں جب سترہویں صدی میں یورپ میں ناول نثر میں لکھے جانے لگے تو انھیں نثری فکشن کہا گیا۔ سر فلپ سڈنی نے اپنی کتاب "شاعری کا دفاع" (DEFENCE OF POESIE) میں تیسری اور چوتھی صدی ق م اور سنہ عیسوی کے اوائل کی داستانوں کو جو نثر اور نظم کی ملی جلی شکلیں ہیں۔ مثلاً "ہیلیوڈورس" (HELIODORUS) کی ایتھوپیکا (ETHIOPICA) زینوفن (XENOPHON) کی سائروپیڈیا (CYROPOEDIA) ۶۶ء میں پٹرونیس (PETRONIUS) کی سٹی ریکون (SATYRICON) اور ۱۵۵ء میں اپولیس (APEULIUS) کی میٹا مورفوسیس (METAMORPHOSES) وغیرہ کو غیر عروضی ایپک شاعری کہا ہے۔

فکشن کا لفظ لاطینی لفظ فکٹیو (FICTIO) یا فرانسیسی لفظ (FICTUS) سے ماخوذ ہے۔ اس لفظ کے معنی لاطینی اور فرانسیسی اصطلاح میں بنانے یا ڈھالنے (FASHIONING SHAPING) کے ہوں گے۔ ویبسٹر (WEBSTER) ڈکشنری کے مطابق فکشن اسے کہتے ہیں جو تخیل کی پیداوار ہو اور جس میں مفروضہ امکانی

---

[1] CLASSIAL LITERARY CRITICISM CH. 4
TRANSLATION BY T. S DORSCH
COX & WYMAN ENGLAND

حقیقت، ہو جسکا واقعیت کی سچائی سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ اور جب ہم لفظ حقیقت یا سچائی فکشن کی ضد کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو اس سے واقعیت، یا سائنٹفک سچائی مراد ہوتی ہے مادبی سچائی نہیں۔ اور اسی لئے ہم تاریخی نثر کو ادب سے الگ کر کے علوم کے زمرے میں لاسکتے ہیں لیکن اس فکشن کو نہیں جو ادبی سچائی کی نشاندہی کرتی ہے۔

اور اگر تاریخ نثر کے بجائے نظم میں لکھی گئی ہو جس کی مثالیں مشرق و مغرب میں ملتی ہیں تو وہ بھی ادب نہیں کہلائے گی بلکہ تاریخ ہی کہلائے گی۔ اسی لئے ارسطو نے کہا ہے:

"مورخ اور شاعر میں یہ فرق نہیں کہ شاعر نظم میں لکھتا ہے اور مورخ نثر میں۔ ہیروڈوٹس کی بہت سی تحریریں منظوم ہو سکتی ہیں لیکن عروضی شکل میں یہ اسی طرح تاریخ رہے گی جیسے غیر عروضی شکل میں۔ فرق یہ ہے کہ ایک (مورخ) وہ کہتا ہے جو وقوع پذیر ہوا ہے۔ اور دوسرا (شاعر) وہ کہتا ہے جو وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ اس لئے شاعری زیادہ فلسفیانہ ہے اور زیادہ سنجیدہ توجہ کی اہل ہے۔ شاعر جامع حقیقت سے متعلق ہے۔ تاریخ خاص حقیقتوں کو برتتی ہے۔ جامع حقیقت سے یہ مراد ہے کہ مفروضہ حالات میں ایک آدمی غالباً یا یقیناً یہ بات کہے گا...... مورخ کا یہ کام ہے کہ وہ کہے کہ مثلاً ایلسیبیڈیز (ALCEBIADES) نے کیا کیا اور اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔"[1]

ارسطو کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں بھی شاعری اور فکشن کے فاصلے یا قربت کا معیار نظم اور نثر یا عروضی اور غیر عروضی نثر و نظم کے فرق پر نہیں قائم کیا گیا اصل معیار جامع حقیقت (UNIVERSAL TRUTH) ہے۔ شاعری یا فکشن کوئی بھی صنف اگر واقعیت، یا خارجی حقیقت کو من و عن بیان کرے گی تو وہ علوم کے دائرے میں آجائے گی اور نہ شاعری ہوگی نہ فکشن۔ یہ اور بات ہے کہ ہم فکشن کا دائرہ بہت وسیع کر دیں اور اس میں تمام تاریخی، سماجی اور تفریحی ناولوں اور افسانوں کو شامل کر لیں لیکن اسی طرح ہم شاعری کا دائرہ بھی وسیع کر سکتے ہیں اور اس میں منظوم تاریخی واقعات، سبق آموز نظموں اور اصلاحی متشابہات (ELLEGORIES) کو شامل کر سکتے ہیں لہٰذا اس قسم کی شاعری اور فکشن کو بھی قریب قریب ایک الگ صنف میں رکھا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر واقعہ نگاری کی صنف میں آنے والی فکشن کا تقابل جامع حقیقت کو برتنے والی شاعری سے کریں گے تو نثر در بعد نظر آئے گا اور کہنے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی شاعری ادب ہے لیکن اس قسم کا ناول یا کہانی ادب نہیں ہے لیکن اگر دونوں فکشن اور شاعری جامع حقیقت کی ترجمان ہوں تو دونوں ادب میں ایک دوسرے کی رشتہ دار ہوں گی۔ ورڈس ورتھ کا قول ہے۔

"بہت سی پیچیدگیاں تنقید میں اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ شاعری اور نثر کو ایک دوسرے کی ضد کہا جاتا ہے۔ برخلاف اس فلسفیانہ نقطہ نظر کے کہ شاعری واقعیت (MATTER OF FACT) یا سائنس کی ضد ہے۔ نثر کی ضد (ANTITHESIS) صرف عروض ہیں۔ لیکن یہ بھی درحقیقت مکمل ضد نہیں کیونکہ نثر میں بھی بہت سی سطریں اور قطعے (PASSAGES) طبعاً عروض میں ہوتے ہیں اور اس سے کنارہ کشی مشکل ہے چاہے جتنا بھی اس سے بچ نکلنے کو بہتر کیوں نہ سمجھا جائے۔"

اور جب ناول اور افسانے میں لفظی اور معنوی امیجز اور استعارات اور سمبل انیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی میں اس طرح استعمال ہونے لگے کہ فکشن اور شاعری ایک دوسرے کے زیادہ قریب آگئے تو شعری ناول اور بیانیہ شاعری کی اصطلاح مستعمل ہوئی اور ان کے فرق کو سیسل ڈے لوئیس (CECIL-DAY-LEWIS) نے جو ۱۹۶۸-۷۲ء میں برطانیہ کا پوئٹ لاریٹ تھا، اس طرح ظاہر کیا ہے۔

"شعری ناول اور بیانیہ شاعری میں فرق صرف نارم کا ہے۔ ہم یہی ایک کارآمد بات کہہ سکتے ہیں کہ ناول نگار اگر اپنے کرداروں کے اعمال کو زیادہ اجاگر کرتا ہے تو اس کے امیجز (IMAGES) زیادہ عملی اور تخیلی سطح کے ہوتے ہیں۔ جبکہ شعوری رو میں لکھا ہوا ناول یا تمثیلی کرداروں کے ناول میں خالص ادراک (IMAGES OF PURE PERFECTION) یا سمبل کے لئے زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔"

[1] "کلاسیکل لٹریری کریٹی سزم"۔ باب ۹

تاہم بات، ہم اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اگر شاعری میں جامع سچائی کے بجائے واقعیت یا مقصدیت ہو تو اس میں امیجز نچلی سطح کے ہوں گے اور سمبل کے لیے گنجائش نہ ہوگی۔ اور اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ شاعری اور فکشن میں کوئی فاصلہ نہیں بلکہ جامع حقیقت کو، خالص ادراک کو، القا یا ویژن کو یونگ کی طرز الابدی یا (ARCHETYPAL) یا لاشعوری امیجز اور علامتوں کو برتنے والی شاعری اور فکشن اونچی برادری کی رشتہ دار ہیں۔ اور واقعیت پر انحصار کرنے والی شاعری اور فکشن دوسری برادری میں شامل ہیں۔ اور اسی لیے کولرج نے کہا تھا:

"میں چاہتا ہوں کہ میرے ہوشیار نوجوان شاعر نثر اور نظم کی میری معمولی تعریف یاد رکھیں۔ وہ یہ کہ نثر = الفاظ کو بہترین طور سے استعمال کرنا۔ نظم = بہترین الفاظ کو بہترین طور پر استعمال کرنا۔"

اور جب فلابرٹ نے اور اس کی تائید میں ہماری صدی کے ناول اور افسانہ نگاروں نے بہترین الفاظ بہترین اسلوب میں استعمال کرنے شروع کیے تو کولرج کا بتایا ہوا فرق بھی مٹ گیا۔ اور شاعری اور فکشن میں صرف عروض کا فرق باقی بچا۔ ادب کی ترقی نے اس فرق کو بھی مٹا دیا۔ کیونکہ اب شاعری کے لیے عروض بھی ضروری نہیں۔ یہاں تک کہ جین تبادو (JEAN THIBADEAU) نے یہی بات ایک نئے انداز میں کہی:

"ناول اور شاعری میں صرف طوالت کا فرق ہے۔ شاعری ایک صفحہ کی ہوتی ہے اور ناول ایک والیوم کا۔"

یہ بات ضرور ہے کہ ناول اور افسانے میں زبان و بیان کی وسعت کی وجہ سے نقطۂ نظر کے گرد کرداروں اور حادثات کا ہالہ ہونے کی وجہ سے نفسیات، جذبات اور تعصبات کے لیے مناسب جگہ بننے کے سبب امیجز، سمبل اور دوسری صنعتیں یا ٹروپ (TROPES) اتنی آسانی سے اور ایک جگہ نہ مل سکیں جیسے غزل یا نظم میں ملتے ہیں۔ لیکن یہ بات شاید فکشن کو ادب کی صنف کی حیثیت سے شاعری پر فوقیت بھی دے سکتی ہے کیونکہ ان میں ادبی حقیقتوں اور زندگی کی سچائیوں کی نمائندگی کے لیے زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔ اچھی شاعری شاید وقت کے ساتھ اپنی افادیت کھو دے مگر اچھا فکشن جس میں اس لمحہ کی عکاسی ہوتی ہے جس میں ماضی، حال، مستقبل سب ایک ہی لمحہ کا حصہ ہوتے ہیں اور تقویم کا فرق لایعنی ہوتا ہے۔ ہمیشہ اور ہر زمانے میں زندہ رہتے ہیں۔ چاہے وہ اچھے رومانی اور تمثالی سائنس فکشن کے روپ میں ہی کیوں نہ ہوں، ایک اچھا افسانہ نگار اور ناول نگار اسی تخلیقی عمل سے گزرتا ہے جس سے شاعر اور اگر تخلیقی عمل کے ساتھ ساتھ تعمیری عمل بھی ضروری ہے تو وہ دونوں پر صادق آتا ہے اور اسی لئے شاید ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا:

"(شاعری) میں نظام اتنا ہی ضروری ہے جتنا الہام۔"

اور اگر ہم ایلیٹ سے اتفاق نہیں کرتے تو ہم اس سے اتفاق نہیں کرتے کہ شاعری اور فکشن میں تعمیری عمل کا فرق ہے۔

ہماری عصری شاعری اور فکشن دونوں ادب کی شاخیں ہیں ان میں برتنے کا فرق ہے اور اپنی اپنی پسند کا، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

سنگھاسن بتیسی

مصنف: فقیرؔ دکنی   مرتبہ: افسر صدیقی

صفحات: ۹۴   قیمت: دس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

غلام عباؔس کا اسلوب

ممتاز احمد خاں

اسلوب ادیب کی پہچان ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ لیکن بات اس سے آگے کی ہے۔ دراصل اسلوب ہی کسی ادیب کی تحریر کو پڑھواتا ہے۔ اسلوب کے ہزار رنگ ہو سکتے ہیں، اس کی کوئی مستقل شکل نہیں۔ یہ اپنے اندر ایک ایسی کشش رکھتا ہے کہ قاری تحریر کو اوّل سے آخر تک پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس طرح تحریر کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ ادیب کا نقطۂ نظر قاری تک پہنچ جاتا ہے اور جو حیرت اس میں پنہاں ہوتی ہے، اس کا بھی ابلاغ ہو جاتا ہے۔ نیز یہ کہ اسلوب ہی وہ ذریعہ ہے جو بڑے ادیبوں کو ادب کی تاریخ میں محفوظ کر دیتا ہے اور ہر دور میں اسے پڑھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر ان افسانہ نگاروں کو دیکھتے چلیں جو اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، عبداللہ حسین، انتظار حسین، شوکت صدیقی اور چند دوسرے ادیب جنھوں نے ادب پر دائمی نقوش ثبت کر دیے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں غلام عباؔس بھی شامل ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلوب تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ خود ایک ادیب اپنے یہاں مختلف تبدیلیاں لاتا ہے۔ اکثر ادیب شروع میں اسلوب کی تشکیل کے کرب سے گزرتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تحریر میں پہلے سے زیادہ رچاؤ اور گہرائی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں راجندر سنگھ بیدی کی مثال دی جا سکتی ہے جنھوں نے بھولا سے "چشم بد دور" تک ایک طویل سفر اپنی تحریر میں حسن پیدا کرنے اور فکر میں گہرائی لانے کے لیے اختیار کیا۔ لیکن اس کے برعکس غلام عباس کا اسلوب اوّل تا آخر وہی رہا۔ انھوں نے اپنی فکر اور اپنے احساس کو اپنے اسی مخصوص سانچے میں شروع سے آخر تک ڈھالا۔ ہمیں ان کے آخری دو افسانوں "ردھی" اور "بندروالا" میں وہی کشش ملتی ہے جو "آنندی" نامی مجموعہ کے افسانوں میں پائی جاتی تھی لیکن اس سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ بیدی صاحب کا اسلوب شروع میں کچّا تھا اور بعد میں وہ پختہ کار بنے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ بیدی صاحب نے جب اپنا تخلیقی سفر شروع کیا تو ان کا اسلوب اس قدر لچکدار تھا کہ وہ اس میں تبدیلیاں کرتے گئے۔ اور غلام عباؔس اپنے اوّلین اسلوب پر قائم رہے اور انھوں نے موضوعات بھی ایسے منتخب کیے جو اسی اسلوب میں ظاہر ہوئے۔ اس کے برعکس بیدی صاحب نے اپنے موضوعات سے انصاف برتنے کی خاطر اپنے یہاں تبدیلیاں پیدا کیں۔ بہرصورت ادب کی دنیا میں ہر دو قسم کی شخصیات ملتی ہیں۔

اسلوب کے سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ کبھی کبھی زبان توڑنے کے عمل سے اسلوب کی پوری عمارت متاثر ہو جاتی ہے، یا پھر یہ کہ لسانی تجربات عام طور پر اسے نامعقول بنا دیتے ہیں، بلکہ ابلاغ کا مسئلہ بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ آج کل جدید افسانے کے ساتھ پیش آ رہا ہے۔ اس وقت جدید افسانے کا حال یہ ہے کہ معدودے چند لکھنے والوں کو چھوڑ کر بیشتر افسانہ نگار کا اسلوب ایسا ہے کہ بڑے بڑے موضوعات کے باوجود ان میں وہ کیفیت نہیں ہے جو عرف عام میں قاری پر لذت طاری کر دیتی ہے۔ کھردرے اسلوب سے آج کے افسانے کو یہ نقصان بھی پہنچا کہ اس میں سے کہانی پن رخصت ہو گیا۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ اکثر جدید افسانہ نگاروں نے اس بارے میں مثبت سوچ کا اظہار کیا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ معروف افسانہ نگار رشید امجد نے کراچی کی ایک ادبی محفل میں کٹ حجتی کے بجائے واضح طور پر کہا کہ جدید افسانے کی بہت تعریف ہو چکی اب ہمیں چاہیے کہ اس کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں پر توجہ دیں تاکہ یہ ترقی کر سکے۔ نیز یہ کہ خود ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی بھی اب کہہ رہے ہیں کہ تجربے بہت ہو چکے۔ اب امر واقعہ کا بیان بھی ہونا چاہیے۔ اور پھر یہی رویہ آج جدید افسانے میں مثبت تبدیلی کا باعث بن رہا ہے۔ اس سلسلے میں اکثر نئے افسانہ نگاروں (خواہ وہ علامت نگار ہوں یا تجدیدیت پسند) کے یہاں یہ تبدیلی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے یہاں اب کہانی پن پہلے کے مقابلے میں زیادہ واضح ہو کر سامنے آ رہا ہے۔ مگر ان کی حیثیت ویسی ہی جدید ہے جو پہلے تھی۔

آج کا افسانہ پہلے کے مقابلے میں فن و فکر کے حوالے سے کافی تبدیل ہو چکا ہے لیکن غلام عباس کلاسیکل حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ان کا اسلوب انھیں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

غلام عباس کے افسانے پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی ڈرامہ نگار کی طرح اپنے افسانوں کا پلاٹ بنا لیتے ہیں، یعنی آغاز، وسط اور اختتام۔ ویسے بھی یہی کلاسیکل پیٹرن ہے۔ وہ اپنی کہانی کے آغاز میں کرداروں کا تعارف کرانے کے بعد ایک مسئلہ سامنے رکھ دیتے ہیں۔ جو کسی ایک کردار یا زیادہ کرداروں کو درپیش ہے۔ "آنندی"، اور "اس حمام میں"، ایسے افسانے ہیں جہاں ایک سے زیادہ کردار کسی مسئلے میں ملوث ہیں۔ اور یہیں سے قاری کا تجسس بیدار ہو جاتا ہے۔ اور جب تک کہانی ختم نہیں ہو جاتی وہ اس سے اپنا تعلق ختم نہیں کر پاتا۔

"پولیس نے ایسی ہوشیاری سے چھاپا مارا تھا کہ ان میں سے ایک بھی بچ کر نہیں نکل سکا تھا، اور بچ کر جاتا بھی تو کہاں۔ بیٹھک کا ایک ہی زینہ تھا جس پر پولیس کے سپاہیوں نے پہلے ہی قبضہ جما لیا تھا۔" [افسانہ - جواری]

"پہلے پہل جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی بھاگ گئی تو وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ شادی کا پہلا ہی سال اور ایسی انہونی سی بات! کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔" [افسانہ - سمجھوتہ]

غلام عباس کے اکثر افسانے بیانیہ تفصیل سے شروع ہوتے ہیں۔ زبان انتہائی سادہ اور منظر کو انتہائی وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والی یہ تفصیل نہ اتنی طویل ہے کہ اکتاہٹ ہو اور نہ اتنی مختصر کہ تاثر ہی نہ پیدا ہو اور الفاظ کی تلاش خراش فن کاری کا نمونہ۔ حقیقتاً غلام عباس کو انتخاب کا سلیقہ آتا تھا۔ وہ اس مالی کی طرح تھا جو یہ جانتا تھا کہ کتنی گھاس کاٹ دینا ہے اور کتنی کو باقی رہنے دینا ہے۔ تاکہ باغ خوشنما نظر آئے۔

"میں شہر کے جس علاقے میں رہتا تھا وہیں ایک صاحب بھی رہتے تھے۔ نام تو ان کا کچھ لمبا سا تھا مگر اس علاقے کے لوگوں میں وہ مسٹر شاہ کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ وہ کسی دفتر میں اونچے درجے پر فائز تھے اور ایک چھوٹے سے خوشنما بنگلے میں رہائش پذیر تھے۔ بڑے خلیق اور ملنسار معلوم ہوتے تھے۔ کیوں کہ ان کے بنگلے کے باہر صبح شام دو ایک موٹریں کھڑی نظر آیا کرتی تھیں۔" [افسانہ ۔ بندر والا]

مندرجہ بالا مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ کم الفاظ میں نہ صرف پوری تفصیل بیان کر دیتے تھے بلکہ قاری کی توجہ اپنے کردار کی طرف متوجہ کرا لیتے تھے۔ اپنی تفصیل کے ساتھ ساتھ وہ مکالمے بھی بڑے چست استعمال کرتے تھے۔ ان کے مکالمے جہاں کرداروں کی نفسیات کا پتہ دیتے ہیں وہاں وہ کہانی کو آگے بڑھانے کا بھی فریضہ انجام دیتے ہیں۔ ان کے مکالمے ہر کردار اپنی عمر، استعداد اور تجربہ کے پس منظر میں بولتا ہے جس سے کہانی یا افسانے میں خود بہ خود ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کہ وہ اپنے مکالموں سے اکثر طنز و مزاح کا بھی کام لیتے ہیں لیکن جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے، وہ اسے سچویشن، چہرے مہرے کے بیان اور کردار کے حلیے وغیرہ کی تفصیل اور پس منظر کے بیان سے بھی تخلیق کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جواری میں پوری سچویشن ہی طنز و مزاح سے بھرپور ہے۔ تمام جواری نکو کی سربراہی میں حوالات میں بند ہیں اور نکو ہر ایک کو یقین دلاتا ہے کہ تھانے دار اس کا قرابت دار ہے اور وہ سب عزت کے ساتھ چھوڑ دیے جائیں گے لیکن ہوتا یہ ہے کہ تھانے دار کے حکم کے تحت وہ سب زمین پر اوندھے لیٹ کر ایک دوسرے کے دس دس جوتے لگاتے ہیں اور آخر میں جب چھوڑے جاتے ہیں تو نکو کہتا ہے ۔ " نہ چالان، نہ مقدمہ، نہ قید، نہ جرمانہ ۔ میں نہ کہتا تھا کہ اسے مذاق سمجھو!"

اسی طرح آتندری میں بلدیہ کا اجلاس اور وہاں طوائفوں کے خلاف کارروائی انتہائی طنزیہ سچویشن ہے۔ اس سچویشن کو مضحکہ خیز بھی کہہ سکتے۔ اس لیے کہ طوائفوں کے اڈے کو ہٹا کر شہر بدر کرنا کوئی حل نہ تھا۔ اور تھوڑے عرصے بعد وہاں ایک زبردست اڈے کا ظہور میں آ جانا از بس ضروری تھا۔ پھر جس طرح طوائفیں اپنے نئے اڈے کو زندگی سے معمور کرتی ہیں اس کی تفصیلات اگر قاری کو قہقہے لگانے پر نہیں تو کم از کم مسکرانے پر ضرور مجبور کرتی ہیں۔ "بندر والا" میں مسٹر شاہ کا اپنے بچّے کو اس طرح پیش کرنا جیسے کہ بندر والا بندر کو پیش کر کے اس کا تماشہ دکھاتا ہے، بذاتِ خود طنزیہ صورتِ حال کو پیش کرتا ہے اور وہاں مکالمے مزاح کا کام دیتے ہیں۔ مسز شاہ کہتی ہیں

"صاحب کیا بتاؤں مسٹر شاہ کو تو بس یہی دھن ہے کہ لڑکے کو اسکول بھیجنے سے پہلے ہی لائق فائق بنا دیں۔ اس کی چوتھی سالگرہ میں بس چند ہی مہینے رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد وہ اسکول جانے لگے گا۔ مسٹر شاہ چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے ہی اردو کے کچھ مشہور شعر بھی اسے یاد کرا دیں، اور کچھ تو یاد کرا بھی دیے ہیں۔ غالب کا وہ کون سا شعر تھا جو ــــ"

میں جلدی سے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

"معاف کیجیے گا بیگم صاحبہ، آپ کا صاحبزادہ بے شک بہت ذہین ہے مگر بیچارہ اس وقت تھک گیا ہوگا، میں وہ شعر کسی اور روز سن لوں گا۔"

اسی طرح اس کے بعد والے مکالمے بھی مزاح سے بھرپور رہیں۔ باجے والا میں باجے والا کا حلیہ مزاح سے بھرپور ہے اور لوگوں کا اسے مار کر نکالنا جہاں ان کی جہالت پر طنز ہے وہاں انسان کی حماقتوں کے المیے کا بھی اظہار ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ غلام عباس

انسان کی غلطیوں، حماقتوں اور ریاکاریوں کا بڑی معصومیت سے پردہ چاک کرتے ہیں لیکن ان سے نفرت نہیں کرتے اور نہ قاری کے دل میں ان کے لیے نفرت کے بیج بوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان کا یقین ہو کہ انسان غلطیوں، حماقتوں، ریاکاریوں اور اپنی انا کی بے جا پرستش کے باوجود قابلِ اصلاح ہے۔ اور یہ کہ انسانی زندگی پیار کیے جانے کے قابل ہے۔ وہ مایوسی کے بجائے رجائیت کی روشنی پھیلاتے ہیں۔ اس لیے بیشتر افسانوں میں کردار نفرتوں کے بجائے آپس میں سمجھوتہ کر کے زندگی کو قابلِ عمل بنا لیتے ہیں۔ اب یہ امر قابلِ بحث ہے کہ غلام عباس ایسا کیوں کرتے ہیں؟ کیوں کہ آج کل یہ تاثر عام ہے کہ انسان ناقابلِ اصلاح ہے۔ اس کے آپس کے رابطے ٹوٹ رہے ہیں۔ رشتوں کا خاتمہ ہو رہا ہے اور تب انسان ماحول کے جبر کا ایسا شکار ہیں کہ وہ ٹوٹ تو سکتے لیکن لچک دار رویہ اختیار نہیں کر سکتے اور ایسی تمام باتیں آج کل کے افسانے میں پیش کی جا رہی ہیں لیکن غلام عباس انسان سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ مثبت اقدار کو اپنا کر زندگی کے جہنم کو جنت میں تبدیل کر سکتا ہے۔ اس کے پیچھے ان کا مشاہدہ اور تجربہ بول رہا تھا۔ وہ کیا ہو رہا ہے، کے ساتھ ساتھ کیا ہونا چاہیے کے وژن کو پیش کرنا چاہتے تھے۔ وہ فلسفی نہ تھے اور نہ نام نہاد یاسیت پرست فلسفیوں کے زیر اثر تھے کہ اپنے افسانوں سے قاری کو مایوسی کا درس دیتے۔ دراصل وہ انسان کو حوصلہ دیتے تھے کہ وہ اپنی فطری قوتوں کو اپنی اصلاح کے لیے استعمال کرے مگر اس کے لیے انھوں نے اپنے افسانوں میں تبلیغ کا سہارا لینے کے بجائے کرداروں کے رویّوں کو پیش کیا ہے کہ وہ ابتدا کیسے کرتے ہیں۔ اور ان کی انتہا کن جذبوں سے عبارت ہے۔ اس کے لیے وہ بیانیہ، طنز و مزاح تینوں کو مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اور اپنے فن پر اپنے نقطۂ نظر کو غالب نہیں آنے دیتے۔

جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے تو بلاشبہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ مصنوعی کرداروں کے بجائے حقیقی کردار پیش کرتے ہیں۔ ایسے کردار جو ہمارے اطراف میں موجود ہیں۔ یا وہ ہم خود ہیں۔ کردار نگاری افسانے کا اہم جزو ہوتا ہے۔ اگر وہ ہمیں کوئی تاثر نہ دے یا ہمیں یاد نہ رہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کردار ہماری نظر میں اپنا وجود کھو بیٹھا ہے "جواری" کا کردار نکو "اس حمام میں" کی فرخندہ بھابی۔ "بامبے والا"۔ "بندر والا"، کے مسٹر شاہ "جھنور"، کے مولوی شفاعت اللہ "کتبہ"، کا کلرک شریف حسین۔ "ردّی"، نامی افسانے کی ردّی۔ "سرخ جلوس"، کی مس گلبرٹ۔ "سمازی مرد"، کی چراغ بی بی اور ایسے دیگر متنوع کردار سامنے آتے ہی پوری کہانی کو ہمارے ذہن میں روشن کر دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے غلام عباس نے پورے برصغیر کے چھوٹے بڑے سب کردار پیش کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہوا تھا۔ یہ بات ان کے زبردست مشاہدہ کی دلالت کرتی ہے۔ گو کہ آج کل کرداری کہانیاں خال خال ہی لکھی جا رہی ہیں لیکن اس کے باوجود تعجب خیز امر یہ ہے کہ خاص طور پہ ماضی کے کرداری افسانے آج بھی ہر طبقے میں مقبول ہیں اور بہت سے اُن نے ناقدین کی یہ فرسودہ دلیل بے کار ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں۔ چوں کہ آج کے سماج میں کردار غالب ہو گیا ہے اس لیے افسانے میں کردار پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ حالاں کہ کردار صرف کور چشم ناقد کو نظر نہیں آتا ورنہ آج کا کردار پہلے کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ اور پیچیدہ ہے۔ میرا خیال ہے اگر غلام عباس آج کے عہد سے متعلق ہوتے تو آج کے کردار کی نفسیاتی تحلیل اس طرح کرتے کہ آج کے سب کردار بھی ادب میں زندہ ہو جاتے۔

کرداروں کے سلسلے میں یہ بات بھی اہم ہے کہ غلام عباس اس کے داخل اور خارج دونوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ خارج کے ماحول کو انھوں نے روایت کے تحت زیادہ نمایاں کیا ہے لیکن کردار کے باطن کو ایکشن یا عمل میں لا کر اسے حقیقی اور سچّا بنانے میں

انھوں نے بڑی فن کارانہ چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسی لیے حسن عسکری مرحوم نے کہا تھا کہ ان کے کردار وں میں بڑی رنگا رنگی ہے۔ ن۔م راشد مرحوم نے بھی لکھا تھا۔

"پھر اس کے اکثر کرداروں کے وجود میں ایک عجیب و غریب ثنویت یا دُہراپن ہے۔ ان کا ایک چہرہ اکثر دکھاوے کے لیے ہوتا ہے جس کی حیثیت گویا خطیب کی چرب زبانی کی ہے جس سے وہ لوگوں کے دل موہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور دوسرا چہرہ ان کے دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ دل کی ان چھپی ہوئی خواہشات کا آئینہ جو ہر بندھن سے آزاد رہنا چاہتی ہیں۔" [مضمون بہ عنوان "تمہید" جاڑے کی چاندنی]

اس تمام بحث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ غلام عباس کا اسلوب بڑا دلچسپ، کھرا، مکمل، سادہ اور موثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے فکشن کے ناقابلِ فراموش کردار بن گئے ہیں۔ یہ ان کے اسلوب ہی کا اعجاز تھا کہ پطرس بخاری نے ایک بار لکھا تھا کہ غلام عباس کے افسانے سب افسانے سے نرالے ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ ان کا ترجمہ کسی یورپی زبان میں ہو جائے تو اور ملکوں کے لوگ بھی انھیں پڑھ کر لطف پائیں۔

کتابی صورت میں پہلا مبسوط جائزہ

بابائے اردو مولوی عبدالحق

حیات اور علمی خدمات

مصنفہ

شہاب الدین ثاقب

صفحات: ۲۵۶ — قیمت: ۴۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

پیش رفت

برصغیر کے قلمی اور نادر ذخیرے

[بی بی سی سے نشر شدہ رضا علی عابدی کی پاک و ہند کے کتاب خانوں کے بارے میں دل چسپ رپورتاژ "کتب خانہ"، کے نام سے پچھلے سال کراچی سے شائع ہو گئی ہے (۱۶۹ ص) اس میں کتابوں اور کتاب خانوں کے بارے میں مفید عمومی اطلاعات کے ساتھ ٹونک، رام پور، پٹنہ، کراچی، کوئٹہ، حیدر آباد، لاہور، بہاولپور، علیگڑھ، اوچ، گیلانی، حیدر آباد (سندھ)، لکھنؤ، کلکتہ کے کتاب خانوں کو خاص طور سے دکھایا گیا ہے۔
بی بی سی کے اس فن کار کے قلم سے خدا بخش لائبریری کے بارے میں جو دل چسپ شذرہ ہے "وہ انھیں خدا بخشے" کے عنوان سے کتاب میں شامل کیا ہے۔ جس کا متن درج ذیل ہے۔]

جب کبھی کہیں اجاڑ موسم آتا ہے تو پرندے وہاں سے بہت دور چلے جاتے ہیں۔ کچھ یہی حال کتابوں کا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ جب عیسائیوں نے قرطبہ پر دھاوا بولا تو وہاں کی کتابیں پٹنہ تک گئیں۔

ایک صاحب تھے، خدا بخش۔ علم و ادب پر اُن کے اتنے احسانات ہیں کہ دل سے ان کے لیے یہی صدا نکلتی ہے کہ خدا بخشے۔ ان کے والد جب انتقال کرنے لگے تو ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک ہزار چار سو کتابیں بیٹے کے حوالے کر گئے اور کہہ گئے کہ جوں ہی حالات اجازت دیں، ان کتابوں کو عوام کے لیے کھول دینا۔

خدا ایسی کتابیں اور ایسے بیٹے سب کو دے۔ خدا بخش علم کے اس خزانے میں نئے نئے جواہر بھرتے گئے۔ یہاں تک کہ ان کے پاس چار ہزار مخطوطے جمع ہو گئے۔ اب یہ کھیتی پک کر تیار تھی۔ بیٹے نے باپ کا خواب پورا کر دکھایا۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۸۹۱ء کو یہ کتب خانہ وقف قرار پایا اور کتب خانے کا نام رکھا گیا "اورینٹل پبلک لائبریری"، اس کے نام میں نہ کسی شخصیت کا نام شامل تھا نہ کسی کاروباری ادارے کا۔

مگر اس زمانے میں عوام طے کیا کرتے تھے کہ ان کا محسن کون ہے۔ چنانچہ لوگ نہ مانے۔ انھوں نے اورینٹل پبلک لائبریری کو اوّل دن سے خدا بخش لائبریری کہا اور بانکی پور کے بارونق علاقے میں وہ آج بھی خدا بخش کے نام سے ماضی کی عظمتوں کا مینارہ بنی کھڑی ہے اور اس کی کرنیں کہاں کہاں نہیں بکھری ہیں۔

پہلے پہل اس کا تعارف پروفیسر گوپی چند نارنگ نے یوں کرایا۔

"اس وقت جو کتب خانہ سب سے اچھا کام کر رہا ہے وہ ہے خدا بخش لائبریری، بانکی پور پٹنہ۔ جس کے ڈائریکٹر عابد رضا بیدار صاحب۔ بڑی محنت سے، بڑے سلیقے سے، بڑی کوشش سے، بڑی لگن سے انھوں نے اہتمام کرایا ہے۔ پرانی چیزوں میں سے بعض چیزوں

کو چھاپ بھی رہے ہیں۔ سال میں ایک دو مرتبہ وہ خاص مشاہیر کو بلا کر ان کے توسیعی خطبات بھی کراتے ہیں اور خدا بخش جرنل کا بھی انھوں نے اجرا کیا ہے۔ جو بھی ملکی یا غیر ملکی اسکالر ہندستان سے، پاکستان سے، مغرب کے یورپی ملکوں سے یا امریکہ سے یہاں دس سے وہاں پہنچا ہے اس کی وہ ہر ممکن مدد کرتے ہیں۔"

پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں کتابیں اور خوبیاں دونوں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ یہ بنیادی طور پر مخطوطات کی لائبریری ہے۔ خصوصاً عربی اور فارسی کتابوں کا یہاں بے مثال ذخیرہ ہے۔ اس کتب خانے میں اردو، فارسی اور عربی کے پندرہ ہزار قلمی نسخے ہیں جن میں سے ابھی صرف آدھے نسخوں کی فہرستیں چھپی ہیں اور وہ دو چار نہیں چونتیس جلدوں میں پھیلی ہوتی ہیں اور اشاعت کا یہ کام ابھی جاری ہے۔ اور نہ معلوم کتنے عرصے جاری رہے گا۔

لیکن خدا بخش کے والد نے تو انھیں صرف ۱۴ سو قلمی کتابیں ہی سونپی تھیں۔ پھر یہ پندرہ ہزار کیسے ہو گئیں؟ یہی سوال میں نے لائبریری کے ڈائریکٹر جناب عابد رضا بیدار سے کیا، کہنے لگے۔

"یہ تو کچھ ایسا ہے کہ آدمی کو کسی بھی چیز کی لگن ہو، پیاس چاہیے انسان کو۔ شدت کی پیاس ہو تو شاید کنواں بھی پیاسے کے پاس آجائے۔ یہ مثال کم سے کم ہمارے لیے تو سچ ثابت ہو کہ خدا بخش کے پاس کتابیں کھنچ کر آتی تھیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ایک عرب کو ملازم رکھا جسے اس زمانے میں وہ پچاس روپیہ مہینہ دیتے تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں پچاس روپے بہت بڑی رقم تھی۔ وہ شخص ڈھونڈ ڈھونڈ کر کتابیں لاتا تھا اور اطلاعیں دیتا تھا کہ فلاں جگہ کتابوں کا ذخیرہ ہے، آپ خود خط و کتابت کر لیجیے، یہ اطلاع ہے۔ تو اس طرح مصر، حجاز، ایران و عراق سے کتابیں ان کو ملتی تھیں، ہندستان بھر سے کتابیں ملتی تھیں۔ ان کی کتابیں ایک بار چوری ہو گئیں۔ کتاب فروش کے ہاں پہنچیں اس نے ان کو اطلاع دی کہ ہمارے پاس کچھ کتابیں بکنے آئی ہیں، آپ خریدیں گے؟ اس طرح وہ کتابیں پھر ان کے حوالے پہنچ گئیں۔ اگرچہ قیمتاً پہنچیں۔"

خدا بخش لائبریری کی دوسری خصوصیت مغل عہد کی پینٹنگز ہیں اور خصوصاً فارسی کی وہ قلمی کتابیں ہیں جن میں مصوّروں نے اپنے شاہکار بنائے ہیں۔

پٹنہ کے اس کتب خانے کی ایک اور خصوصیت اردو کے پرانے رسالے اور جریدے ہیں۔ ان کا جتنا بڑا ذخیرہ یہاں ہے دوسری جگہ شاید ہی ملے۔ خدا بخش لائبریری میں گزرے وقتوں کے تقریباً ایک ہزار مختلف اردو رسالوں کے کئی لاکھ شمارے محفوظ ہیں۔ مگر یہ ایسا بیکراں سمندر تھا کہ اس میں اگر آپ کسی خاص عنوان کی تلاش کرتے تو بھوسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنے کے مترادف ہوتا۔ لہٰذا لائبریری نے ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین کے فہرست وار کارڈ بنانے شروع کیے ہیں اور اب تک دو لاکھ سے زیادہ اشاریاتی کارڈ تیار کر لیے ہیں اور ابھی تو بہت کام ہونا باقی ہے۔

ان لاکھوں کارڈوں کی تیاری میں خدا بخش لائبریری نے ایک دلچسپ اور کامیاب تجربہ کیا، یعنی اس کام میں طالب علموں کو بھی شریک کر لیا اور انھیں پانچ پیسے فی کارڈ کے حساب سے معاوضے کی پیشکش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طالب علم دن میں دو تین گھنٹے کام کر کے پانچ سے سات روپے تک کما لیتا تھا جس سے ان کا اپنا خرچ اور تعلیم کا خرچ نکل آتا تھا۔ اس تجربے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سینکڑوں طالب علموں

میں چار پانچ سال کے اس کام کے دوران کتب خانے کا ذوق پیدا ہوا۔ اور اب وہ باقاعدگی سے لائبریری کو استعمال کرتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

خدابخش لائبریری کی کچھ اور خصوصیات عابد رضا بیدار صاحب نے بیان کیں:

"ہم دوسری جگہوں سے اہم مخطوطات کی مائیکروفلم حاصل کر رہے ہیں۔ کتب خانوں سے بھی اور ایسی جگہوں سے بھی جہاں برباد ہونے کے خطرے زیادہ ہیں۔ مثلاً خانقاہوں وغیرہ میں ایک آدھ جگہ ایسی بھی ہے جہاں اصل مخطوطے تلف ہو چکے ہیں، صرف ان کے عکس ہمارے پاس محفوظ ہیں۔

ایک شعبہ ہم نے ابھی حال ہی میں کیسٹ اور ٹیپ کا قائم کیا ہے، جو اہم لوگ ہیں ان کی آوازیں صدابندی کے بعد یہاں محفوظ کر لی جاتی ہیں۔ ایک اور چیز جو شروع کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مصنفوں سے ان کے مسودے لے لیے جائیں جو چھپنے کے بعد عموماً پھینک دئے جاتے ہیں۔ وہ بھی آئندہ ریسرچ کا موضوع بن سکیں گے۔

ایک اور شعبہ جو اب شروع ہو رہا ہے وہ معاصر اسلام، یا Contemporary Islam کہلائے گا۔ مستقبل کا مورخ جب آج کے اسلام کی تاریخ لکھے گا تو وہ اس دور کی دستاویزوں کو خدابخش لائبریری میں اپنا منتظر پائے گا۔ اس نئے شعبے میں عالم اسلام کی وہ تمام دستاویزیں جمع ہوں گی جن کا تعلق دین سے ہے۔

دستاویزوں کی بات چل رہی ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ ہندستان کی تحریک آزادی کی اردو دستاویزوں کا بڑا ذخیرہ خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ تحریک آزادی کے دور میں قلم کے محاذ پر جتنی جنگ اردو زبان میں لڑی گئی ہے اس کا کسی کو اندازہ نہیں۔ اپنی بات عوام تک پہنچانے کے لیے اس وقت کے بڑے بڑے رہنما اردو میں لکھتے تھے۔ چنانچہ خدابخش لائبریری کے شیلف تیج بہادر سپرو، موتی لال نہرو اور لاجپت رائے جیسے صفِ اول کے رہنماؤں کی اردو تحریروں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہی حال مسلم رہنماؤں کی تحریروں کا ہے۔ بیدار صاحب نے اچھی بات کہی کہ ان تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کی ساری دولت صرف افسانے یا شعر نہیں تھے بلکہ غیر معمولی سنجیدہ موضوعات پر بھی لوگ دل جما کر لکھتے تھے۔

یہ اس دور کی بات ہے جب چکبست کا رسالہ "صبح امید" پیارے لال شاکر کا "العصر"، نوبت رائے کا "ادیب"، اور دیا نرائن نگم کا رسالہ "زمانہ"، شائع ہوا کرتے تھے۔ خدابخش لائبریری اپنے جرنل میں ان رسالوں کا انتخاب شائع کر رہی ہے۔ جس میں مثال کے طور پر منشی پریم چند کی بہت سی ایسی کہانیاں موجود ہیں جو ان کے مجموعوں میں نہیں آئیں۔ سائنس پر بھی بہت سے مضامین ہیں۔ جب کہ اردو والے بھول گئے کہ سائنس میں کبھی ایسا لٹریچر بھی پیدا ہوا تھا۔

خدابخش لائبریری ایک اور بڑا کام یہ کر رہی ہے کہ نادر اور قابلِ ذکر قلمی نسخوں کو جدید کتابوں کی شکل میں چھاپ رہی ہے تاکہ علم کی اس بند سیپ سے نکال کر یہ موتی عام لوگوں کے گھروں کو بھی منور کر سکیں۔

ایسے ہی ایک مخطوطے کا ذکر عابد رضا بیدار صاحب نے کیا۔

"یہاں دیوانِ حافظ کا ایک نسخہ ہے۔ ہمایوں کو جب ایران میں پناہ لینا پڑی تو وہ وہاں سے ایک نسخہ لایا۔ وہ نسخہ پھر دارا شکوہ تک چلتا رہا۔ دارا نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ ہمارے خاندان میں ایک نسخہ

چلا آرہا ہے جس سے ہمارے باپ دادا فال نکالا کرتے تھے۔ اس کے حاشیوں پر فال کا اندراج موجود ہے۔ مثلاً ہمایون اور جہانگیر کی نکالی ہوئی فال۔ اور مجھے شبہ ہے کہ ایک جگہ شاہ جہاں کی نکالی ہوئی فال کا اندراج موجود ہے۔ وہ ہم جوں کا توں آفسٹ پر چھاپ رہے ہیں۔ تاکہ ان کا اصل خط عوام کے سامنے آجائے۔"

مُوبَد، مغلوں کے آخری عہد کا بہت بڑا دانشور تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس نے دبستانِ مذاہب لکھی تھی جس کا بعد میں سارے مغرب نے Schools of Religion کے نام سے مطالعہ کیا۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ مُوبد شاعر بھی تھا اور صاحب دیوان تھا۔ اس کے دیوان کا صرف ایک نسخہ تھا جو خدا بخش لائبریری میں نکل آیا۔ اس دیوان کی روشنی میں وہ اور بڑا دانشور نظر آتا ہے۔ یہ دیوان بھی چھاپا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ بیدار صاحب نے بتایا:

"ہم نے عہدِ شاہ عالم کی ایک محاورات کی لغت چھاپی ہے جنھیں آپ ہندی یا اردو دونوں سے محاورات کہہ سکتے ہیں۔ اس عہد میں ایسی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ اس سے قبل کی ایک لغت چھاپ رہے ہیں، جو اورنگ زیب کے پوتے کے لیے لکھی گئی۔ اورنگ زیب نے اپنے پوتے کے لیے اتالیق مقرر کیا تھا۔ اس نے علوم ہندیہ پر ایک انسائیکلوپیڈیا لکھی، اس میں سے ہم نے لغت کا حصہ نکال لیا ہے، جو اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں چھاپا جارہا ہے۔ کیونکہ وہ ہندی کی بھی ایسی لغت ہے جیسے اردو کی۔ ایسے ہی ایک منصوبہ ہے۔ "تاریخ خاندان تیموریہ" چھاپنے کا جو مغل مصوّری کا بہترین نمونہ کہا جاتا ہے اور اس کے لیے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ مصوّری کا تاج محل ہے۔"

علوم مشرقی کے اس کتب خانے نے جو شاندار روایات قائم کی ہیں اُن کا اسے صلہ بھی خوب ملا اور نہ جانے کتنے بزرگ وصیت کر گئے کہ ان کی کتابوں کے ذخیرے خدا بخش لائبریری کو دے دیے جائیں۔ یا پھر ان کے پسماندگان نے ان کے ذخیرے اس کتب خانے کو پہنچا دیے اور ظاہر ہے اس کام کا تو اب کہاں کہاں پہنچا ہو گا۔ آرہ کے ڈاکٹر رشید الدین احمد مرحوم پٹنہ کے ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم اور سابق وزیر تعلیم سر فخر الدین مرحوم کی کتابوں کے ذخیرے اس کتب خانے کو مل گئے۔

کھجوہ میں دیوان ناصر علی صاحب کا ذخیرہ تھا جسے سخت نقصان پہنچا۔ مگر جو کتابیں اور مخطوطے بچ گئے وہ خدا بخش لائبریری نے حاصل کر لیے۔ ان میں دیوانِ ہمایوں کا نسخہ بھی شامل ہے۔ حکیم علیم الدین بلخی صاحب نے اپنے والد کی کتابیں اس کتب خانے کو دیدیں جن میں مکتوبات صدی جیسی قیمتی کتاب شامل ہے جس پر مظفر شمس بلخی کی اپنی تحریر میں حاشیوں پر Notes لکھے گئے ہیں:

ایک اور عظیم الشان کتب خانہ جو خدا بخش لائبریری میں منتقل ہوا اس کا احوال بھوپال میں اردو کے محقق اور استاد عبدالقوی دسنوی صاحب نے سنایا:

"پٹنہ سے تیس میل دور ایک گاؤں دسنا ہے جہاں کے علّامہ سلیمان ندوی ہیں۔ وہ میرا گاؤں ہے۔ وہاں ایک بڑا عظیم کتب خانہ تھا۔ الاصلاح لائبریری! اس میں بہت سے قلمی نسخے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب بہت سے لوگ وہاں سے چلے گئے اور ویرانی بڑھنے لگی تو ہم سب کو احساس ہوا کہ اس لائبریری کو محفوظ کیا جائے۔ چنانچہ اس زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر بہار تھے۔ ان سے ہم لوگوں نے رجوع کیا۔ ان تک

پہنچے اور ان سے کہا کہ کسی طرح اس کتب خانے کو بچائیے کہ یہ قیمتی سرمایہ ضائع نہ ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں تو ڈاکٹر صاحب نے بڑی دلچسپی لی ورسدے کتب خانے کا بہت اچھا حصہ خدا بخش لائبریری منتقل کر دیا۔ یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ پہلا گاؤں دیسنا ہے جس نے اتنی بڑی قربانی دی صرف اس لیے کہ آئندہ کام کرنے والوں کے لیے یہ مفید طور سے استعمال ہو سکے اور زیادہ سے زیادہ لوگ تحقیق کر سکیں۔"

تو یہ ہے ایک جیتے جاگتے اور پھلتے پھولتے کتب خانے کا احوال۔ اس کی موجودہ عمارت اب بڑھا کر دوگنی کی جا رہی ہے۔ اس میں ایرکنڈیشنڈ کمرے ہوں گے جن میں قلمی کتابیں محفوظ رہیں گی۔ میں جس روز وہاں پہنچا، بہت بڑے عملے کو مصروف پایا۔ کہیں تحقیق ہو رہی تھی کہیں اشاراتی کارڈ بن رہے تھے۔ کہیں زیروکس کاپیاں اور مائیکرو فلمیں بنائی جا رہی تھیں۔ اور کہیں خوشنویس بیٹھے پرانی دستاویزوں کی نقلیں اتار رہے تھے۔ ایک شعبے میں جلد بندی ہو رہی تھی۔ ایک گوشے میں ناقص کاغذوں کو موسم کے اثرات اور کیڑے مکوڑوں سے بچانے کے لیے کیمیاوی عمل جاری تھا۔ خلیج کے علاقے سے ایک بزرگ تشریف لائے تھے جو زکوٰۃ پر اتھارٹی ہیں، وہ قدیم کتابوں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کتب خانہ قارئین سے بھرا ہوا تھا اور ہر طرف زندگی کے آثار اور ہر سمت چہل پہل تھی۔

یہ تو تھی زمین کی صورتِ حال۔ آسمانوں تک میری نگاہ تو نہیں پہنچی۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ وہاں کہیں خدا بخش کی روح مسرور ہوگی —— خدا کے ہاں ایسے ہی لوگوں کی بخشش ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے!!۔

(مرسلہ۔ خدا بخش لائبریری)

چینی کہانیاں

ترجمہ: شفیع عقیل

قیمت: ۵ روپے

جاپانی کہانیاں

ترجمہ: شفیع عقیل

قیمت: تیس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ بابائے اردو روڈ کراچی

کیا اھم شخصیّتیں بے نام وپتہ بھی ہوسکتی ہیں؟

جی ھاں

این آئی ٹی بیئرر یونٹ کے خریدار

جن کا نام پتہ نہ ہم جانتے ہیں نہ پوچھتے ہیں تاہم اس سے
ان کی اہمیّت کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ اسلئے کہ این آئی ٹی بیئرر یونٹ
کے خریداروں کو شناخت کی کوئی ضرورت نہیں۔

آپ بھی این آئی ٹی بیئرر یونٹ بغیر کسی لکھت پڑھت
کے خرید سکتے ہیں۔ منافع حاصل کرنے کے لیے یونٹ سرٹیفکیٹ
بمع منسلک کوپن پیش کریں اور کوپن کے عوض
نقد رقم وصول کریں۔ بوقتِ ضرورت این آئی ٹی بیئرر یونٹ
بآسانی بھنائے جاسکتے ہیں۔

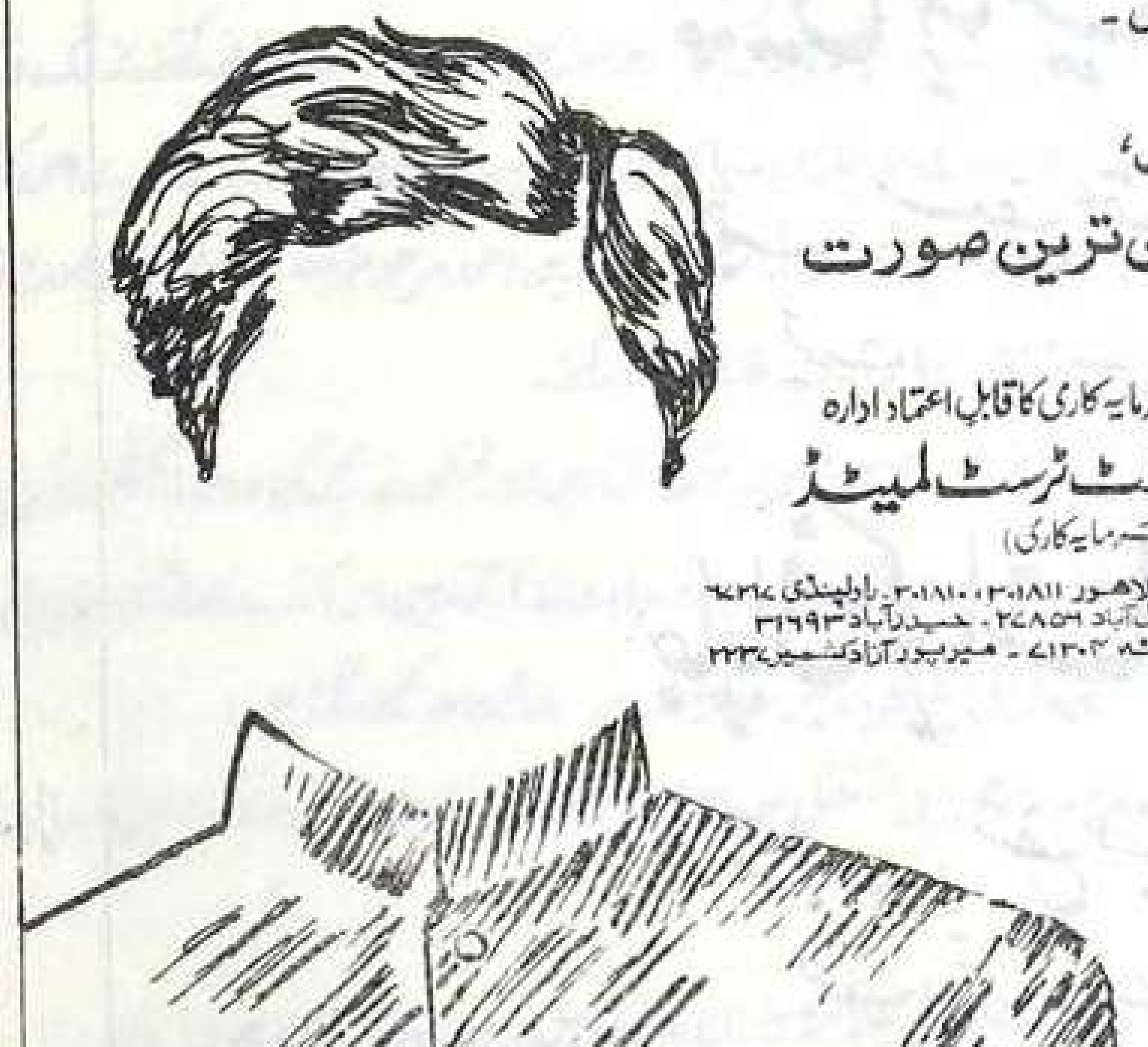

این آئی ٹی بیئرر یونٹ،
سرمایہ کاری کی آسان ترین صورت

این آئی ٹی سرمایہ کاری کا قابلِ اعتماد ادارہ
نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ لمیٹڈ
(امانتِ قومی سرمایہ کاری)

NATIONAL INVESTMENT TRUST LTD. NIT

کراچی ۵۹۔ ۲۲۳۰۵۹۔ طارق روڈ کراچی ۴۳۴۳۱۸۔ لاہور ۳۰۱۸۱۱، ۳۰۱۸۱۰۔ راولپنڈی ۶۴۳۱۷
اسلام آباد ۸۲۸۷۱۱۔ ملتان ۷۵۲۱۵۔ فیصل آباد ۲۴۸۵۹۔ حیدرآباد ۳۱۶۹۳
سکھر ۱۵۸۵۳۷۔ پشاور ۷۳۸۳۸۔ کوئٹہ ۷۱۳۰۳۔ میرپور آزاد کشمیر ۲۲۳۷

PID-I-2/84

United

جرمن کہانی

مصنف: برتولت بریخت

دو بیٹے

مترجم: آصف فرخی

جنوری ۱۹۴۵ء میں جب ہٹلر کی جنگ اپنے انجام کو پہنچنے والی تھی، مقبوضہ تھیوریگیا میں ایک کسان کی بیوی نے خواب دیکھا کہ محاذِ جنگ پر اس کا بیٹا اسے پکار رہا ہے، اور غنودگی کے عالم میں جب وہ صحن میں نکل کر آئی تو اسے ایسا لگا کہ وہ نل کے پاس کھڑا ہوا پانی پی رہا ہے۔ عورت نے اسے آواز دی تو اسے احساس ہوا کہ وہ ان نوجوان روسی جنگی قیدیوں میں سے ایک تھا جو اس علاقے کے کاشت کاروں کے پاس جبری مشقت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ چند دنوں کے بعد اسے ایک عجیب تجربہ ہوا۔ قریبی واقع درختوں کے ایک کنج میں، وہ ان قیدی سپاہیوں کے لیے ان کا کھانا لے کر آرہی تھی۔ سپاہی کٹے ہوئے درختوں کے تنے اکھاڑ رہے تھے۔ جاتے جاتے عورت نے اپنے کندھے کے اوپر سے نظر ڈالی تو اسے وہی قیدی سپاہی دوبارہ نظر آیا — بیمار اور کمزور سا — جو اپنے چہرے پر بے حد مایوسی کا تاثر لیے ہوئے شوربے کے اس پیالے کی طرف دیکھ رہا تھا، جو کسی نے اس کی طرف بڑھا رکھا تھا، اور اچانک اس قیدی سپاہی کا چہرہ عورت کے بیٹے کا چہرہ ہو گیا۔ اس کے بعد کئی دن ایسا ہوتا رہا کہ اچانک اس نوجوان کا چہرہ اس کے بیٹے کے چہرے میں بدل جاتا اور اتنی ہی جلدی غائب ہو جاتا۔ پھر وہ قیدی بیمار ہو گیا اور بھوسے کے کھلیان میں پڑا رہا، جہاں اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس عورت کے دل میں رہ رہ کے یہ خیال اٹھتا کہ سپاہی کے لیے کھانے کی کوئی چیز لے کر جائے، مگر اسے اس کا بھائی روک دیتا جو جنگ میں زخمی ہو جانے کے بعد کاشت کاری کا کام سنبھالتا تھا اور قیدیوں کے ساتھ بہت بدسلوکی سے پیش آتا تھا، خاص طور پر جب سے حالات بالکل خراب ہو چکے تھے اور گاؤں کے لوگ جنگی قیدیوں سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ وہ عورت اپنے بھائی کی دلیلوں پر کان بند نہیں کر سکتی تھی، وہ خود یہ سمجھتی تھی کہ ان وحشی درندوں کی مدد کرنا ٹھیک بات نہیں ہے، جن کے سیاہ کرتوتوں کے بارے میں وہ بڑے قصے سن چکی تھی۔ وہ ہر وقت یہ سوچ کر سہمی رہتی تھی کہ دشمن اس کے بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کریں، جو مشرقی محاذ پر موجود تھا۔ لہٰذا اس قیدی سپاہی کی مدد کرنے کا اس کا ادھورا سا ارادہ ابھی عملی صورت اختیار نہیں کر پایا تھا کہ ایک شام اچانک غیر متوقع طور پر پھلوں کے باغ میں اس کی مڈبھیڑ قیدیوں کی ایک ٹولی سے ہو گئی جو سب کے سب بڑی تن دہی سے باتیں کرنے میں مصروف تھے اور سردی کے باوجود وہاں پر غالباً رازداری کی وجہ سے اکٹھے ہوئے تھے۔ وہ سپاہی بھی ان میں تھا، بخار کی شدت سے کانپ رہا تھا اور اپنی حد سے زیادہ کمزور حالت کی وجہ سے ہی اس عورت کو دیکھ کر سب سے زیادہ گھبرا گیا۔ گھبراہٹ کے عالم میں اس کا چہرہ پھر اسی تبدیلی سے دوچار ہوا، اور اس عورت نے جب اس کی طرف دیکھا تو وہ اس کے بیٹے کا چہرہ تھا اور یہ چہرہ بہت خوف زدہ تھا۔ وہ اس کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور حالاں کہ اس نے فرض شناسی کے جذبے کے تحت جو کچھ سنا تھا، جا کر اپنے بھائی کو بتا دیا، پھر بھی اس نے دل میں ٹھان لی کہ وہ اس سپاہی کو چپکے سے کچھ گوشت دے آئے گی۔ یہ کام بھی، ہٹلر کی "تیسری رائخ" میں کیے جانے والے دوسرے بہت سے نیک کاموں کی طرح، بے حد خطرناک اور دشوار ثابت ہوا۔ اس کام میں اس کا بھائی ہی ایک

کا دشمن تھا اور یہ بھی یقین نہیں تھا کہ جن کی وہ مدد کر رہی ہے اس کے دوست ہیں۔ لیکن پھر بھی اس نے یہ مرحلہ کامیابی کے ساتھ طے کر ڈالا۔ اس کو معلوم ہو گیا کہ یہ قیدی سپاہی فرار کا منصوبہ بنا رہے ہیں، کیوں کہ سرخ فوج کی پیش قدمی کے ساتھ روز بروز یہ خطرہ بڑھتا جا رہا تھا کہ انہیں یا تو مغرب کی جانب منتقل کر دیا جائے گا یا موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ وہ عورت ان فرمائشوں سے انکار نہ کر سکی جو قیدی سپاہی نے اشارے کی زبان اور ٹوٹی پھوٹی جرمن میں اس سے کیں، کیوں کہ اس عجیب تجربے نے اسے اس سپاہی کے ساتھ زنجیر بستہ کر دیا تھا اور یوں اس نے اپنے آپ کو ان قیدیوں کے فرار کے منصوبے میں ملوث ہو جانے دیا۔ اس نے انہیں صدری اور بڑے مٹھے والی قینچی فراہم کی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس کے بعد سے اس نوجوان جنگی قیدی کے چہرے میں تبدیلی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ محض اس اجنبی کی مدد کر رہی تھی۔ لہٰذا وہ اس وقت بہت حیران ہوئی جب فروری کی ایک صبح اس کے دروازے پر دستک ہوئی اور کھڑکی کے نیم روشن شیشے میں سے اس نے اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔ اب کی بار وہ اس کا بیٹا ہی تھا۔ وہ جرمن فوج کا پھٹا ہوا یونی فارم پہنے ہوئے تھا۔ اس نے مضطرب ہو کر بتایا کہ اس کا دستہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور روسی فوجیں ان کے گاؤں میں محض چند کلو میٹر کے فاصلے پر ہیں۔ اس کی گھر واپسی کو خفیہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ کھلیان کے ایک کونے میں عورت، اس کے بھائی اور اس کے بیٹے کا خفیہ اجلاس ہوا اور یہ طے ہوا کہ سب سے پہلے ان جنگی قیدیوں سے چھٹکارا پانا چاہیے، کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے جرمن سپاہی کو دیکھ لیا ہو، اور اگر نہ دیکھا ہو تب بھی وہ قید کے دوران کی جانے والی بدسلوکی کی گواہی تو دے سکتے ہیں۔ قریب ہی پتھروں کی ایک کان واقع تھی۔ جرمن سپاہی نے اصرار کیا کہ رات کے وقت وہ ان قیدیوں کو ایک ایک کر کے کسی بہانے سے کھلیان کے باہر لائے گا اور انہیں مار ڈالے گا۔ بعد میں ان کی لاشوں کو کان میں پھینک دیا جائے گا۔ اس سے پہلے انہیں تھوڑی سی شراب پلا دی جائے گی۔ اس طرح شراب پلائے جانے پر قیدیوں کو تعجب نہیں ہو گا۔ عورت کے بھائی نے خیال ظاہر کیا، کیوں کہ کچھ دنوں سے وہ اور دوسرے کھیت کے مزدور ان روسی قیدیوں سے دوستی جتانے لگے تھے، تاکہ جب فیصلے کی گھڑی آ پہنچے تو یہ ان لوگوں کی طرف سے زیادہ بدگمان نہ ہوں۔ جب جرمن سپاہی اپنے منصوبے کی تفصیلات بتا رہا تھا تو اس نے اپنی ماں کو چھُرا چھُری لیتے ہوئے دیکھا۔ دونوں مردوں نے آپس میں طے کر لیا کہ وہ اسے کسی صورت میں بھی کھلیان کے قریب نہیں جانے دیں گے۔ دہشت کے عالم میں وہ دن ڈھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ روسی سپاہیوں نے شراب شکریے کے ساتھ قبول کر لی، اور اس عورت نے انہیں نشے کی حالت میں آکر اپنے اداس بھرے گیت گاتے ہوئے سنا۔ مگر جب رات کے گیارہ بجے کے قریب، اس کا بیٹا کھلیان کے اندر گیا تو قیدی سپاہی غائب تھے۔ وہ نشے میں نہیں تھے انہوں نے جان بوجھ کر مدہوش ہونے کا جھوٹا تاثر دیا تھا۔ گاؤں والی کی اس زبردستی طاری کی ہوئی بے تکلفی اور دوستی نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ روس کی سرخ فوج اب بہت قریب آگئی ہو گی۔ روسی فوج رات کے آخری حصے میں نمودار ہوئی۔ عورت کا بیٹا شراب کے نشے میں دھت، کھلیان کے مچان پر پڑا تھا، اور وہ پریشان ہو کر اس کی پرانی جرمن وردی جلانے کی کوشش کر رہی تھی، اس کا بھائی بھی نشے میں تھا، لہٰذا اس پر روسی سپاہیوں کو خوش آمدید کہنے اور کھانے کی چیزیں لا کر دینے کی ذمہ داری آن پڑی۔ وہ کام کرتی رہی اور اس کا چہرہ جیسے پتھر کا بنا ہوا تھا۔ روسی صبح سویرے چلے گئے، سرخ فوج نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ عورت کا بیٹا جو رات بھر کی بے خوابی کے بعد خستہ حال ہو رہا تھا، اور شراب مانگنے لگا اور اس نے اپنے مصمم ارادے کا اعلان کیا کہ وہ پسپا ہوتے ہوئے جرمن دوستوں میں شامل ہو جائے گا تاکہ لڑائی میں شامل رہ سکے۔ عورت نے اس کو یہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ اب جنگ میں شامل ہونے کا مطلب یقینی تباہی ہے۔ مایوس ہو کر اس نے اپنے بیٹے کا راستہ روک لیا اور اسے اپنے بدن کا زور لگا کر اسے اس ارادے سے باز رکھنا چاہا۔ بیٹے نے اسے بھوسے پر واپس دھکیل دیا۔ جب وہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ اس

کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے اور اس نے زور کا دھکا مار کر اس بدحواس آدمی کو نیچے گرا دیا۔
اسی صبح ایک کسان عورت قریب کے گاؤں میں عارضی طور پر بنائے ہوئے روسی ہیڈ کوارٹرز میں گھوڑا گاڑی چلاتی ہوئی لائی اور اپنے بیٹے کو ان کے حوالے کر دیا، جسے اس نے بیل جوتنے کی رسّی سے باندھ رکھا تھا، اور اسے جنگی قیدی بنا کر ان کے حوالے کر دیا، تاکہ ــــــ اس نے ایک ترجمان کے ذریعے انہیں سمجھانے کی کوشش کی ــــ تاکہ اس کا بیٹا زندہ بچ جائے۔

ڈاکٹر انور سدید کی نئی کتاب

اُردو ادب کی تحریکیں

امیر خسرو سے لے کر عہدِ حاضر تک اُردو ادب کی اہم تحریک کا تجزیہ۔
اس کتاب پر مصنّف کو پنجاب یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی۔
یہ کتاب سی ایس ایس کے امتحان اور ایم اے اُردو کے چوتھے پرچے کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔

چند مندرجات

ریختہ کی دو تحریکیں	ایہام کی تحریک	اصلاحِ زبان کی تحریک
علیگڑھ تحریک	فورٹ ولیم کالج	انجمن پنجاب کی تحریک
رومانوی تحریک	ترقی پسند تحریک	حلقۂ اربابِ ذوق
اقبال کی تحریک	اسلامی ادب کی تحریک	ارضی ثقافتی تحریک

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اُردو پاکستان، بابائے اُردو روڈ۔ کراچی ۱

گلہائے رنگ رنگ

مشتاق شاد
الریاض۔ سعودی عرب

[نوٹ :۔ یہ بول پنجاب اور آزاد کشمیر کے دیہاتوں میں مقبول ترین اور یکساں گائے جانے والے لوک گیت "ماہیا" کے بول ہیں "ماہیے" کے ان بولوں میں ایک مٹیار اپنے ان پڑھ ہونے پر پشیمانی کا اظہار کر رہی ہے۔ ساجن کو خط لکھنے کو جی چاہتا ہے مگر لکھ نہیں سکتی اور نہ ہی اپنے دل کی بات کسی کو بتا سکتی ہے۔]

پچھتاوا

سکول دیکھا نہ رغبت رہی کتابوں سے
میں آشنا نہیں حرفوں کے ماہتابوں سے
الف ہے میرا شناسا نہ سب سہیلی ہے
جو تو نے لکھا وہ میرے لیے پہیلی ہے
میں کیا تجھے ترے خط کے جواب میں لکھوں
اداس لفظوں کو دل کی کتاب میں لکھوں
میں دل کی بات کسی ڈھب سے کہہ نہیں سکتی
جو تجھ سے کہنا ہے وہ سب سے کہہ نہیں سکتی
جو میرے دل میں ہیں جذبات کون سمجھے گا
اگر کہوں تو مری بات کون سمجھے گا
کہ مجھ پہ ہجر کے لمحوں میں کیا گزرتی ہے
اک ایک شب میں صدی کی سزا گزرتی ہے
جو چار لفظ بھی مکتب میں پڑھ لیے ہوتے
تو خط میں سینکڑوں ارمان لکھ دیے ہوتے
میں ایک حرفِ وفا ہی جو تجھ کو لکھ سکتی
تو آتے جاتے پرندوں کو کس لیے تکتی
خدا کرے کسی ان پڑھ کا پیار ہو نہ جدا
اداس پھول سے فصلِ بہار ہو نہ جدا

پنجابی لوک گیت

۱۔ کوٹھے اتوں اڈ کانواں
پڑھی ہوئی آپ ہوواں
خط ماہیے نوں لکھ پاواں

۲۔ گل گل تے جی بولاں
خط جدوں لکھے منشی
سچ پچھ لے تے کی بولاں

۳۔ کجھ بول دی نئیں سکدی
گنڈ جیہڑی دل دے اندر
کتے کھول دی نئیں سکدی

نثری ترجمہ :۔

۱۔ اے کوے! میری منڈیر پر سے اڑ جا کہ میرے پاس اپنے ساجن کو دینے کے لیے کوئی سندیس نہیں ہے۔ اگر میں خود لکھی پڑھی ہوتی تو اسے پیار کے دو بول ہی لکھ دیتی۔

۲۔ جب میں منشی سے اپنے محبوب کو خط لکھواتی ہوں تو اس کے ہر سوال پر "ہوں ہاں" اور "جی" کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ اگر کبھی اس نے سچی بات پوچھ لی تو میں کیا جواب دوں گی۔

۳۔ نہ تو میں کسی سے کچھ کہہ سکتی ہوں اور نہ ہی اپنے دل کے بھید اور باتیں کسی پر ظاہر کر سکتی ہوں۔ (کاش میں پڑھی لکھی ہوتی تو اپنے محبوب کو دل کے ہر جذبے سے آشنا کرتی)

[نوٹ :- یہ گیت آزاد کشمیر کے پہاڑی علاقوں سے حاصل کیا گیا ہے ۔ اور اس کی زبان بھی "پہاڑی" ہے ۔]

دل کا دروازہ کھول دیا

کل شام ڈھلے اک چندرے نے دروازہ آن بجایا تھا
میں جگنو بانٹ کے آئی تھی وہ کرنیں لینے آیا تھا
میں آہٹ سے گھبرائی بھی دروازے کے پاس آئی بھی
کنڈی کو ہاتھ لگایا بھی کچھ سمٹی، کچھ شرمائی بھی

پوچھا کیا لینے آئے ہو تم شب کے ڈھلتے سایوں میں
کیوں زور کی دستک دیتے ہو بدنامی ہے ہمسایوں میں
بولا میں تیرا ماہی ہوں کچھ سکھ سپنوں کا راہی ہوں
تو میرے دل کی دنیا ہے میں تیرے پیار کی شاہی ہوں

کیوں بند ہیں مجھ پر دروازے کیوں ہر جانب دیواریں ہیں
تو ویرانوں میں بیٹھی ہے اور میرے ساتھ بہاریں ہیں
آ سکھ کے سپنے عام کروں آ سب کچھ تیرے نام کروں
تو میرا دن اُجیارا ہے میں تیری روشن شام کروں

میں کان لگائے سنتی تھی، ہر بات اترتی تھی دل میں
کچھ لاج سی مجھ کو آتی تھی کچھ شرم سے مرتی تھی دل میں
کیا جانے کیا پھر لول دیا بس پیار کا امرت گھول دیا
زنجیر لگی رہنے دی مگر دل کا دروازہ کھول دیا

آزاد کشمیر کا پہاڑی لوک گیت

۱- چن مہاڑا چڑھیا تے بوہے نال ڈھکیا
گلاں انھونڑیاں تے سارا پنڈ جگیا

۲- چن مہاڑا چڑھیا تے دِسیا بڑا اٹیاں
بوہا مہاڑا ابھنیا تے کدے مارے جھاتیاں

۳- چن مہاڑا چڑھیا تے توتاں سنیا پھانکراں
ایہو دل کیتا چندِ چندرے نے ناں کراں

نثری ترجمہ :-

۱- میرا چاند چمکا اور اس نے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا ۔ اس کی ایسی انہونی باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں جن سے سارے گاؤں میں بدنامی کا ڈر ہو ۔

۲- میرا چاند چمکا ہے اور اب ٹیلوں کے آس پاس دکھائی دے رہا ہے ۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے جھانکنے کے ساتھ ساتھ میرا دروازہ توڑنے کی کوششیں شروع کر دی ہیں ۔

۳- میرا چاند چمکا ہے اور شہتوت کی ساری شاخوں پر اس کی چاندنی پھیل گئی ہے ۔ اب میرا یہی جی چاہ رہا ہے کہ میں اپنی زندگی کی ساری بہاریں اس چاند کے نام لکھ دوں ۔

گلہائے رنگ رنگ

سندھی کہانی

مصنف :۔ موہن کلپنا

مترجم :۔ رفیق احمد نقش

وہ شام

مجھے لگا وہ شام میں نے پہلے بھی دیکھی تھی، لیکن بالکل نہیں دیکھی تھی میں نے ـــ بالکل نہیں دیکھی تھی میں نے ایسی شام۔ شاید کبھی سوچی ہو یا کہیں پڑھی ہو یا سنی ہو۔ کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل ہے۔ تمام فکریں وقت کے ساتھ پھولوں کی طرح مرجھا جاتی ہیں، اصول، ارادے!

ایک چیز سے میں نے بے حد محبت کی ہے، فرسٹ کلاس ویٹنگ روم ـــ مزے سے اشنان کروں، اخبار پڑھوں، صوفے پر لیٹی ہوئی عورتیں کروٹ بدلیں، دیکھوں یا نہ دیکھنے کا ڈھونگ رچاؤں، آرام کرسی پر بے آرامی سے لیٹوں، شیخ ایاز کے شعر پڑھوں یا ماہتاب محبوب کی کہانیاں۔ میں آزاد، ماحول پُر تصرّف، چائے پر چائے، سگریٹ پر سگریٹ، خواب پر خواب اور پھر گاڑی کی کوئی مانوس کوکو۔ لیکن اس شام میں رتلام میں مارا گیا جب اعلان ہوا کہ سیلاب کی وجہ سے نہ کوئی گاڑی بمبئی جائے گی اور نہ کوئی گاڑی دہلی جائے گی۔ دونوں گاڑیوں کے مسافر براہِ کرم گاڑیوں سے نہ اتریں، صبح تک صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔

مسافروں کی بھاگ دوڑ شروع۔ جیسے بہ یک وقت ایک ہی جگہ حج کے زائر اور کنبھ کے یاتری اکٹھے ہو گئے ہوں۔ بھاگا میں بھی ویٹنگ روم کی طرف۔ دیکھتا ہوں وہاں بھی بھیڑ۔ اور ایک عورت جو ایک ہاتھ سے برقعہ اوپر کر کے اور دوسرے سے بیگ پکڑے دروازے سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی مگر بھیڑ کی وجہ سے پیچھے ہٹی جا رہی تھی۔ دو دفعہ گری بھی، دونوں دفعہ اپنی چھاتی اور بیگ دونوں کو سنبھالا۔

میں نے اسے سہارا دیا، وہ کھنچی چلی آئی ہم ایک کونے میں جا کر کھڑے ہو گئے۔

"تمہارا شوہر؟"، میں نے ایک پکا ہندستانی سوال کیا۔

"یہاں نہیں ہے۔"

"کہاں جا رہی ہو؟"

"بمبئی۔"

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور شاید سوچا کہ میں آدمی کیسا ہوں

"آپ؟"

"میں دہلی جا رہا ہوں۔ سپریم کورٹ میں ایک اپیل داخل کرنی ہے اور کل آخری تاریخ ہے مجھے کسی بھی طرح صبح دہلی پہنچنا ہے لیکن ساری رات تو میں کہیں نہ جا سکوں گا، اور تم؟ تم اکیلی کہاں جاؤ گی؟"

"بس، پلیٹ فارم پر بیٹھی رہوں گی۔"

"کیا مسلم عورتیں بھی اکیلی سفر کر سکتی ہیں؟"

"دیکھتے رہیے۔"

"تم چاہو تو میں تمہارے لیے ایک رات اس شہر میں رہنے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔"

"بہتر" اس نے کہا، "اور آپ؟"

"مجھے بھی کوئی چھت مل جائے گی۔"

میں نے نٹ راج ایئر کنڈیشنڈ ہوٹل میں ڈبل بیڈ والا کمرہ اس لیے بک کرایا کہ سنگل بیڈ کا انتظام نہ تھا۔ فرسٹ فلور پر پچھم کی طرف کونے والا۔

باہر ایک ٹیرس تھا، جہاں ایک میز اور دو کرسیاں پڑی تھیں۔ اوپر نیلے رنگ کا بلب اور، اور بھی اوپر سامنے پیلے رنگ کا چاند۔

وہ اندر گئی۔ میں باہر کرسی پر بیٹھا رہا۔ آدھ گھنٹے بعد کپڑے تبدیل کر کے باہر آئی اور سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کا چہرہ ایسے چمکنے لگا تھا جیسے پانی پر چاند کا عکس پڑے۔

اوپر بھی چاند، نیچے بھی چاند۔ اس کے جسم کی خوشبو کچھ کچھ مہندی اور آم کے پتّوں کی طرح مانوس لگی۔ آنکھیں بند کر دو پھر بھی لگتا ہے کہ پہلو میں کوئی من رنجن، من بھاون ہے۔

مینیجر نے سو روپے ایک رات کے ایڈوانس لیے اور پوچھا۔ "آپ کا نام؟"

"کچھ بھی، مسٹر اے۔ مسٹر بی۔ مسز بی، ناراض ہو گئے؟ اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے! پیشانی پر بل نہ ڈالیں۔ مسٹر اور مسز، خیر......"

اس کی نگاہیں جیسے جنت کی سیڑھیاں ہیں اور ہم زینے سے یوں چڑھے جیسے یکشن اور گندھرو بادلوں کے زینے پر قدم رکھتے سُرگ دھام جا رہے ہوں۔ زندگی جیسے پہاڑوں سے نیچے جاتا ایک شاہی راستہ بائیں موڑ، دائیں چکّر، گول اور گول، نیچے اور نیچے ایک لمبی کبھی ختم نہ ہونے والی کھائی۔ ذہن میں تناؤ اور ایک دن — ایک بڑا دھماکہ اور کھیل ختم۔

"چلتا ہوں۔" میں نے بیگ اٹھایا اور کہا "خدا حافظ۔"

"تو آپ مسلم ہیں؟"

"نہیں ہندو ہوں۔"

"کہاں کے؟"

"کہاں کا؟ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے ہوں سندھ کا۔"

"تو تم سندھ کے ہو؟"

اس نے مجھے "تم" کہہ کر جیسے میرے سگریٹ سے دھواں اور میری قلموں سے سفیدی کھینچ نکالی۔ میں جیسے ایک دم چھوٹا ہو گیا۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"، میں نے کہا۔

"میں بھی سندھی ہوں"، اس نے کہا۔ "کچھ دن کے لیے انڈیا گھومنے آئی ہوں۔"

"تم ـ مگر تم تو مسلمان ہو!"، لیکن میں اپنے اس احمقانہ سوال پر اچانک خود شرمندہ ہو گیا۔ سوال بھی میں نے شاید اس لیے کیا تھا کہ ایک عرصے میں نے کوئی ایسی عورت نہیں دیکھی تھی جو جوان بھی ہو، سندر بھی ہو، مسلمان بھی ہو اور سندھی بھی ہو۔ یہ چار چیزیں (اکٹھی) تو میں نے ہندستان میں کہیں بھی نہیں دیکھی ہیں ـــــ اس نے بے تکلفی سے ہنسنا چاہا مگر اس کے چہرے پر حیا کا تبسّم نمودار ہوا۔ جیسے گھُپ اندھیرے میں دودھ جیسا اُجالا پھوٹ پڑا۔

"تو نے کوئی سندھی مسلم عورت نہیں دیکھی ہے، کیوں؟ تو پھر بیٹھ اور مجھے دیکھ، جی بھر کے"، اس کی اس جارحانہ اپنائیت میں، میں نے کچھ آزاد ہو کر پوچھا "تجھے میں نے اپنی بیوی لکھوایا، تو تو نے شاید میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہوگا۔"

"آپ کو میں نے بیٹھنے کے لیے کہا ہے اور پھر بھی یہ سوال؟ وکیل شاید بات کو غلط سمجھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ نہیں نہیں تمہارا گلہ نہیں کر رہی ہوں۔ شوہر کے بعد اگر کبھی کوئی عورت کسی کو پسند کرلے تو وہ تجھ جیسا ہی نیک ہوگا۔"

کچھ کچھ میں نے بھی ایسا ہی محسوس کیا کہ بیوی کے بعد اگر کبھی کوئی عورت پسند آجائے تو وہ اس جیسی ہی بھلی مانس ہوگی ـــ اور پھر چائے پر چائے، بات پر بات، میرے سگریٹ، اس کی مسکراہٹ، دھواں، دھند اور چاندنی، وہ بھی اس کی آنکھوں پر پھیلتی ہوئی۔ رات کے دو بج کر پچاس منٹ ہوئے تھے جب شہر کی تاریکی چاند کے غروب ہو جانے کی وجہ سے تلخ ہو گئی اور دسمبر کی ٹھنڈ نے شہر کو فریج بنانا شروع کیا۔

میں نے کہا، "تبسّم، تم آرام کرو"، نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے گھڑی دیکھی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اٹھ کر کمرے میں گئی۔ دو کمبل اٹھا کر باہر آئی۔ اس نے ایک مجھے دیا اور دوسرا خود لپیٹ کر مسکرانے لگی۔

کچھ باتیں کیں، ہم نے شاید کچھ بھی باتیں نہیں کیں اور میں نے جب بدن کو کمبل سے ڈھکا، اس نے کہا "سندلالا"، اور آسمان کی طرف دیکھنے لگی جیسے خود بخود طبلے اور سارنگیاں بجنے لگیں، یا شاید خاموشی! لطافت میں نہایت باریک ہو گئی۔

شام پڑے تو مرد اور عورت آپس میں کچھ بات نہ کریں۔ شام ان سے بات کرے۔ ان کے لیے شام کے بعد براہِ راست صبح ہوتی ہے، بیچ میں رات نہیں ہوتی۔ رات تو اس دور کا نام ہے جب مرد اور عورت بستر پہ لیٹتے ہیں۔ وہ رات بھی شام ہے جس کے ساتھ بیداری شامل ہو۔ بستر تو تھے لیکن وہ کمرے میں تھے ہم ٹیرس میں، اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کرسیاں تو جیسے ہمارے من اور ذہن میں گھُس گئی تھیں۔ ہم جیسے فریج میں رکھے ہوئے برف کے دو ٹکڑے ـــــ تاروں بھرا آکاش کسی ریل اسٹیشن سے آتا کوئی الٹا شہر لگا۔ گھُپ اندھیرا، چپ شام۔

صبح معلوم ہوا کہ بمبئی کی طرف کی گاڑیاں چلنے لگی تھیں۔ یعنی میں دہلی سپریم کورٹ نہیں پہنچ سکا تھا اور بمبئی واپس لوٹنے پر مجبور رہا تھا مگر بمبئی تو تبسّم بھی جا رہی تھی۔ اس لیے میں دو تکلم میں رک گیا، نہ معلوم کیوں! میں کہہ نہیں سکتا۔ کچھ بھی یقین سے کہنا میرے لیے مشکل ہوتا ہے۔

گاڑی جب پلیٹ فارم سے چھوٹی اور چلی تب اس نے ایک لفافہ مجھے دیا ـــ کوئی خیالی ہاتھ رومال کی طرح ہوا میں لہرایا اور میری آنکھوں میں اٹک گیا۔ وہ فقط مسکرائی اور اس نے رومال کو ہونٹوں اور آنکھوں کے بیچ رکھا۔ وہ اور گاڑی دونوں چلی گئیں۔ کوئی بھی خون کی دھار گاڑی سے نہ پھوٹی۔ اور میں اپنے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں سو روپے کے نوٹ پڑا تھا اور اس پہ لکھا تھا، خدا حافظ۔

خدا ہی تو حفاظت کرتا ہے ہماری۔ اور تو کچھ بھی نہیں۔ تبسّم نے بھی جیسے کہا، کوئی بھی احسان نہیں، خوش رہ! خدا حافظ۔

۱؎ ایک اردو شعر سے متاثر ہو کر

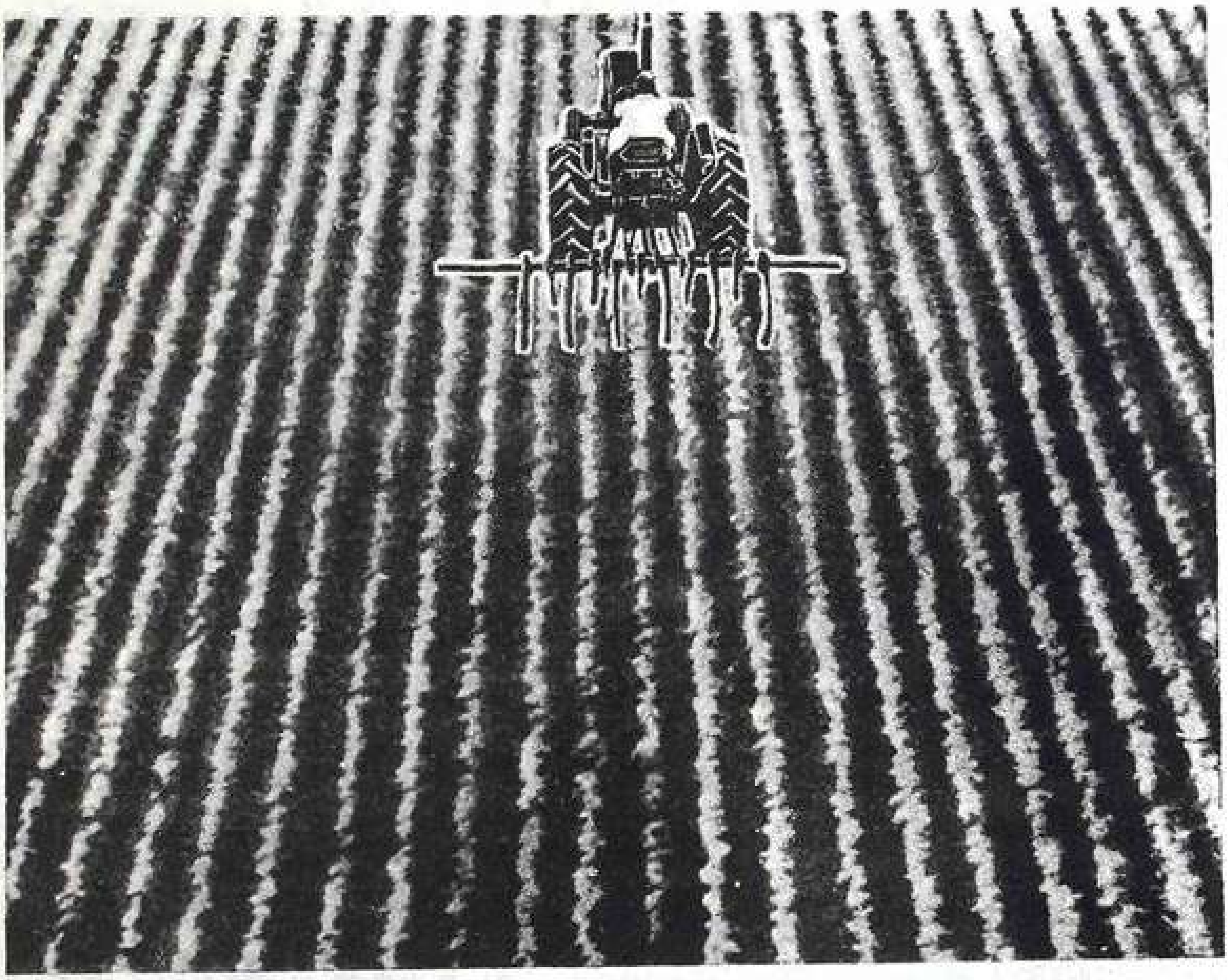

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے...

صدیوں سے ہمارے وطن کی سرزمین غلہ کی پیداوار کا گہوارہ رہی ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی، آبادی میں بے انتہا اضافہ کے باوجود، ہماری زمین نہ صرف اپنے ملک کی آبادی کے لئے خوراک مہیا کر سکتی ہے بلکہ ہم دوسرے ممالک کو بھی غلہ برآمد کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم زراعت کے قدیم طریقے ترک کر کے جدید طریقے اپنائیں۔ ہم اب ٹیکنالوجی کے دور کی دہلیز پر کھڑے ہیں!

زرعی ترقیاتی بینک ملک کی زرعی معیشت میں اہم تبدیلیاں لانے کے لئے ہمہ وقت کوشاں ہے۔ بینک کسانوں کو زراعت کے جدید ترین اصول اپنانے میں مدد دیتا ہے تاکہ ہم جلد از جلد اپنی زرعی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

زرعی ترقیاتی بینک

زرعی ٹیکنالوجی اپنائیے

سیول ہنٹس انٹرنیشنل

گوشۂ طلبہ

جغرافیہ کا اطلاقی پہلو اور جائزہ

پروفیسر رباب رضوی

موجودہ صدی کے پچھلے پچاس سال کے دوران جغرافیائی مضامین میں کافی وسعت ہوئی ہے۔ اس کی اسی وسعت پذیری نے اس کو متفقہ طور پر ایک منظم علمی حیثیت بخشی ہے۔

ماہرینِ ماحولیات کے نظریہ کے پیشِ نظر علم جغرافیہ انسان اور اس کے گرد پائے جانے والے طبعی ماحول کے باہمی رابطہ اور تعلق کا علم ہے۔ اور جس قدر اس رشتہ اور تعلق کو سمجھنے کی کوششیں جاری ہیں، اسی قدر یہ علم سائنسی اور مفید ترین شکل اختیار کرتا جارہا ہے۔ ابتدائی نظریات کے مطابق اس علم کو دریاؤں، پہاڑوں، شہروں اور پیداوار وغیرہ کی تفصیلات سمجھ لینے تک ہی محدود کرلیا گیا تھا۔ لیکن زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان نظریات میں زیادہ ٹھوس خیالات اور فکر وشعور کو دخل حاصل ہوتا گیا۔ اس وقت یہ ایک ایسے ترقی پذیر علم کی حیثیت سے سامنے آیا ہے جس کی اساس اس امر پہ ہے کہ طبعی اور ثقافتی ماحول کیوں اور کیسے وجود میں آتا ہے اور کس طرح وہ تمام تر عناصر کے ساتھ انسانی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہو رہا ہے اور یہ کہ ماحول کی نقش بندی کے ساتھ ساتھ انسانی فلاح و بہبود کے کن کن پہلوؤں میں کس طرح ترمیم اور اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے معنوں میں یہ انسان کی ماحول سے مطابقت کر لینے یا ماحول کو اپنے مطابق ڈھال لینے کا جائزہ لیتا ہے۔ جس میں فی الواقع انسان زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر اسکاٹ کیلٹی کی جانب سے پیش کی جانے والی جغرافیہ کی تعریف برمحل اور حقیقت پر مبنی قرار دی جاسکتی ہے۔ اس کے نزدیک سطح ارضی پر پائے جانے والی مختلف اشکال اور صورتوں کے انسانی ماحول کے طور پر مطالعہ کا نام "علم جغرافیہ" ہے۔ یہاں انسانی ماحول کو سمجھنے کے لیے ان عناصر ماحولی کا جائزہ لینا انتہائی ضروری ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اس کی تشکیل عمل میں لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہئیتِ ارضی (Lands of Terrains) آب وہوا، نباتات، علاقائی مٹی کی نوعیت، حیوانات وغیرہ وہ قدرتی عناصر ہیں جو کسی بھی علاقے کے ماحول کی تشکیل کا سبب بنتے ہیں۔ چنانچہ انسان کو اپنی بود و باش کے لیے وہ علاقے زیادہ راغب کرتے ہیں جہاں وہ آب وہوا کے شداید سے محفوظ ہو اور جہاں نباتات وحیوانات کی نشو ونما کے لیے موزوں حالات اور روز مرہ کے استعمال کے لیے مختلف معدنیات کا حصول ممکن ہوسکے۔ علاوہ ازیں خود انسان کے اپنے مہیا کردہ ذرائع نقل وحمل، پیدا کردہ رسم و رواج اور تاریخ و روایات کو پھلنے پھولنے کا موقع حاصل ہوسکے۔ ان دونوں ماحولیات میں گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ اور کسی خطہ یا علاقہ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں

کو سمجھنے کے لیے ان دو نوں ماحولیاتی عناصر کی نوعیت اور کیفیت کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں جو اصول واضح طور پر سامنے آتے ہیں اگر ان کو ہم ملکی اور قومی سطح پر علم جغرافیہ میں ایک باضابطہ اور مکمل طور پر مقام دینا چاہیں تو یہ قباحت محسوس ہوتی ہے کہ ملکی سطح پر پاکستان میں علم جغرافیہ کو ابھی تک اس کے روایتی انداز سے نجات نہیں مل سکی ہے اور یہ علم تاحال سائنس اور فنون کے درمیان ایک غیر واضح اور مبہم کڑی سمجھا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی اطلاقی اہمیت غیر یقینی کا شکار ہے۔ اور روز بروز اس کی معنویت غیر تسلی بخش صورتِ حال سے دوچار ہے۔ جغرافیہ اصولی طور پر اقتصادیات سے براہِ راست تعلق رکھنے کے باوجود عملی طور پر ملکی معیشت میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کر رہا ہے اور نہ ہی اقتصادی منصوبہ بندی کے ذمہ دار اس کو کوئی اہم مقام دینے کے لیے تیار ہیں۔ ارضیات، موسمیات، بحریات، معاشیات اور تاریخ جیسے طبعی اور عمرانی علوم نے جغرافیہ کی وسعت کو محدود کر رکھا ہے اور ملک کی ترقیاتی منصوبہ بندیوں میں جغرافیہ دانوں کے لیے عدم گنجائش نے نہ صرف اس مضمون سے وابستہ لوگوں کے لیے معاشی مشکلات پیدا کر کے روزگار کے مواقع محدود کر دیے ہیں، بلکہ اس تصوّر کو بھی روز بروز تقویت ملتی جا رہی ہے کہ جغرافیہ غیر عملی اور غیر سائنسی مضمون ہے۔ اس تصوّر کو اس حقیقت نے بھی نمایاں کیا ہے کہ ہماری درس گاہوں اور منصوبہ بندیوں میں اس مضمون کو عملاً کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے، اور اس مضمون کو متعارف کرانے کے لیے کافی جدوجہد سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ قومی رابطہ کے عوامل بھی اس سلسلہ میں غیر دلچسپی اور لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس لاعلمی اور غیر دلچسپی کی وجہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟ اس کے مسائل کی بنیاد کیا ہے؟ اس کی حدود وسعت کا احاطہ کیوں نہیں کیا جا سکتا ہے؟ اور یہ کہ اس کے عملی پہلو کی نقش بندی کس طرح کی جا سکتی ہے؟

ان سوالات سے گزرنے کے بعد اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ "علم جغرافیہ" کو بہ حیثیت ایک مضمون کلّی اور مطلق طور پر سائنسی بنیادوں پر استوار کیا جائے اور اس کی عملی افادیت کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا جائے تاکہ ماہرین مختلف ترقیاتی منصوبوں کی تدوین و تشکیل کے وقت طبعی و ثقافتی ماحول کی توضیحات کو سمجھیں اور اس کے لیے جغرافیہ کی استعدادی طاقت سے فائدہ اٹھائیں۔ علوم ارضی و عمرانی اور ان کی دیگر شاخوں مثلاً ارضیات، ارضی طبیعات، ارضی کیمیا، موسمیات، بحریات، شماریات، تاریخ و معاشیات کے مطالعہ کے نتائج کو طبعی ماحول کے پس منظر میں اطلاقی طور پر پیش کریں۔ اس سلسلہ میں خالصتاً جغرافیہ کے ایسے شعبے اور شاخیں بھی موجود ہیں جہاں وہ اپنی تحقیقی اور عملی کارروائیوں کو انتہائی منظم اور نتیجہ خیز انداز میں پیش کر سکتا ہے۔ چنانچہ جغرافیہ کی مختلف شاخیں مثلاً ثقافتی، نباتاتی، زرعی و تاریخی حصّے اس کے اہم جز ہیں تاہم اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جغرافیہ کو بہ حیثیت ایک اطلاقی مضمون ملک کی معاشی ترقی کے کام میں لایا جائے اور اس کی اہمیت کو سمجھا جائے۔

اس طرح یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس مضمون کے مختلف پہلوؤں پر جس قدر سائنسی بنیادوں پر توجہ دی جائے گی اتنا ہی اس کی افادیت اور دلچسپی کے پہلو نمایاں ہوں گے اور یہ مضمون زیادہ مربوط، پہلودار اور ہمہ گیر حیثیت سے پیش کیا جا سکے گا جس کے بعد ماحولیاتی مسائل کے درمیان مطابقت و معاونت پیدا کر کے حقیقی نتائج کو سامنے لایا جا سکے گا۔ جو افراد اس کو اختیاری درجہ کے طور پر قبول کرتے ہیں نہایت ضروری ہے کہ ان کی عمومی تعلیمی صلاحیت اچھی ہو تاکہ وہ اس مضمون کو سائنسی معیار پر لا کر استفادہ حاصل کریں اور ملک کے مختلف ترقیاتی منصوبوں میں نتیجہ خیز بنیادوں پر شامل کیے جا سکیں۔

گوشۂ طلبہ

برطانیہ کا سیاسی نظام

جغرافیائی و معاشی اثرات

ریحانہ مغنی، لیکچرر سرسید گرلز کالج

نصاب میں حالیہ تبدیلیوں سے قبل سیاسیات کے طلبہ دساتیر کا مطالعہ محض تاریخی اور قانونی زاویہ ہائے نظر سے کرتے تھے۔ لیکن جدید تقابلی سیاسیات کی روشنی میں کی گئی حالیہ تبدیلیوں کے بعد اس کا مطالعہ محض دستور تک محدود نہ رہ کر پورے سیاسی نظام پر حاوی ہو چکا ہے۔

"سیاسی نظام" کی اصطلاح کے اضافہ سے جہاں ایک طرف سیاسیات کا مضمون زیادہ دلچسپ اور زندگی سے قریب تر آگیا ہے وہاں سیاسیات کے طالب علم کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

آج سیاسیات محض کتابی دنیا سے نکل کر زندہ سانس لیتی ہوئی متغیر، متحرک اور معاشرہ کے دیگر اداروں، نظاموں اور رویوں سے اپنا تعلق استوار کیے ہوئے اور آپ کے تحقیقی و تجرباتی میلانات کے لیے ایک چیلنج کی صورت میں موجود ہے۔

بہ قول ایسٹن یا المنڈ سیاسی نظام ایک مخصوص ماحول میں پرورش پاتا ہے جس کی تشکیل اندرونی و بیرونی ماحول کے عوامل کرتے ہیں۔

طلبہ کی سہولت کے لیے ہم نے پیشِ نظر مضمون میں برطانوی سیاسی نظام پر اندرونی ماحول کے ایک اہم عامل جغرافیائی و معاشی نظام کے اثرات کا سرسری جائزہ لیا ہے۔

برطانیہ کا محلِ وقوع اور سیاسی استحکام

کسی ملک کا محلِ وقوع، اس کی سیاسی ہیئت کی تشکیل میں کتنا زبردست کردار انجام دیتا ہے اس کا اندازہ برطانوی سیاسی نظام کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ یہ ملک بحر اوقیانوس کے شمال میں مغربی یورپ کی ساحلی پٹی سے صرف ۲۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے لیکن ۲۲ میل کی یہ ساحلی پٹی جزائر برطانیہ کو صدیوں شاندار طریقے سے الگ تھلگ (GLORIOUS ISOLATION) رکھے رہی جس کے باعث برطانیہ یورپ کے دیگر ملکوں کے مقابلے میں دوسری قوموں کے حملوں سے بہت کچھ محفوظ رہا اور امریکہ کی طرح اپنے معاشی وسائل کو قومی ترقی و استحکام پر خرچ کرتا رہا۔

انھیں ساحلوں پر پرورش پلنے والے لوگوں میں بہترین ملاح نکلے جنھوں نے دنیا کے دور دراز علاقوں تک رسائی حاصل کی اور ان ملکوں میں برطانیہ کے پرچم کو سربلند کیا۔ انھیں ساحلوں کی دعوت پر برطانیہ نے دنیا کی بہترین بحریہ تشکیل دی جس کی مدد سے برطانیہ نے ۱۹۱۹ء تک ساڑھے چودہ ملین مربع میل کا علاقہ اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ جو[1] ۱۹۳۹ء میں بڑھ کر پورے پندرہ ملین مربع میل تک جا پہنچا۔

برطانوی دولتِ مشترکہ

آج اگرچہ پندرہ ملین مربع میل کے اس علاقے میں سے بیشتر علاقے آزاد ہو چکے ہیں اور ان آزاد ملکوں پر مشتمل ادارہ دولت مشترکہ نے عالمی سیاست میں اہم جگہ حاصل کرلی ہے۔ ایسے علاقے جہاں برطانوی نژاد قومیں آباد ہیں مثلاً کینیڈا یا آسٹریلیا ان کے آج بھی برطانیہ کے ساتھ خصوصی تعلقات قائم ہیں۔ دولت مشترکہ ایسے ممبر ممالک جن کا تعلق افریقی یا ایشیائی قوموں سے ہے[2] وہ بھی ملکہ برطانیہ کو دولت مشترکہ کے اتحاد کی علامت تسلیم کرتے ہیں۔ دولتِ مشترکہ کے ممبر ممالک کے ساتھ برطانیہ کی ۳۲ فیصد درآمدی و برآمدی تجارت ہوتی ہے۔ برطانوی بینکوں میں ان ملکوں کی بڑی بڑی رقوم جمع رہتی ہیں۔ تقریباً تمام ممالک سوائے کینیڈا کے اسٹرلنگ علاقہ میں شامل ہیں، ہر سال تقریباً ۸۰ ہزار برطانوی ان ملکوں کو جاتے ہیں اور تقریباً اتنے ہی برطانیہ آتے ہیں۔ تعلیم، سائنس، صنعت و حرفت اور تجارت سے متعلق برطانیہ کے ساتھ ان ملکوں کے دوطرفہ معاہدات ہیں۔

دولتِ مشترکہ کے ممبر ملکوں کے ساتھ برطانیہ کو نہ صرف تجارتی بلکہ سیاسی مفادات بھی حاصل ہوئے۔ تمام ممالک کے وزرائے خارجہ اور وزرائے عظمیٰ کی ملاقاتیں مخصوص اوقات پر ہوتی رہتی ہیں۔ یہ اجلاس بڑے اہم سیاسی اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔

فوج کی سیاست میں عدم مداخلت

جزیرہ ہونے کے نتیجہ میں برطانیہ نے برطانوی دولتِ مشترکہ کے علاوہ کچھ اور بھی ٹھوس فوائد حاصل کیے۔ مثلاً برطانیہ کے ساحلوں نے بہ طور چیلنج ایک مضبوط بحریہ کی تشکیل اور تنظیم پر اپنی تمام توجہ مرکوز رکھی۔ لہٰذا مضبوط بری فوج نہ ہونے سے برطانوی سیاسی نظام پر ایک مثبت اثر یہ مرتب ہوا کہ بحری فوج نے سلطنت کی حدود میں توسیع اور ملکی سرحدوں کا تحفظ تو خوب کیا لیکن برطانیہ کی ملکی سیاست میں فوجی مداخلت کبھی رواج نہ پا سکی۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کے جمہوری اداروں کی فطری نشوونما ایک تسلسل کے ساتھ برقرار رہی جبکہ یورپ کے بعض دیگر ملکوں میں ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ مثلاً فرانس، اسپین میں جمہوری اداروں کا تسلسل فوجی مداخلت سے بار بار ٹوٹتا رہا۔ سوویت روس میں آج بھی فوجی عنصر کو بعض دستوری تحفظات حاصل ہیں۔

---

[1] سلیکٹ ماڈرن گورنمنٹ ــــ سعید اے ملک، اے۔ کے رائے

[2] سلیکٹ ماڈرن گورنمنٹ ــــ مصنفین سعید اے ملک۔ اور اے کے رائے

رقبہ آب و ہوا اور جذبۂ قومیت

برطانیہ کا رقبہ صرف ۲۳۹۶۱۱ مربع کلو میٹر ہے جو پاکستان کے ایک تہائی رقبہ سے بھی کم ہے۔ شمالی علاقہ پہاڑی ہے۔ تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ آبادی کا زیادہ حصہ وسطی اور جنوبی انگلستان میں آباد ہے۔ اسی لیے آبادی کی گنجانی ۵۹۲ ء ۴۸ افراد فی مربع میل کے اعتبار سے برطانیہ مغربی دنیا میں پہلے نمبر پر آتا ہے۔ مغربی ساحل پر گلف اسٹریم نام کی گرم پانی کی رو بہتی ہے جس کی وجہ سے مغربی ساحل سال بھر جہاز رانی کے لیے کھلا رہتا ہے اور مغربی ہواؤں سے بارش ہوتی ہے۔ جبکہ مشرقی حصہ میں مقابلتاً کم بارش ہوتی ہے اور زیادہ عرصہ سورج نکلا رہتا ہے۔ حالانکہ اسی منطقے کے دوسرے علاقے سال بھر شدید سردی کی لپیٹ میں رہتے ہیں۔ لیکن برطانیہ میں آب و ہوا میں اعتدال اور یک رنگی سمایہ عنصر اسے بعض دیگر مغربی ملکوں پر امتیاز بخشتا ہے۔

آب و ہوا کی یک رنگی اور رقبہ کے اختصار کا یہ نتیجہ ہوا کہ پوری آبادی کی رہن سہن، زبان، ادب، ثقافت اور طرزِ فکر میں بھی بہت حد تک یک رنگی پیدا ہو گئی۔ جس نے پوری آبادی کو ایک وحدت میں ڈھال دیا۔

یہ جغرافیائی علیحدگی اور آب و ہوا کی یک رنگی کا مشترکہ وصف ہمیں برطانیہ کے علاوہ جاپان اور کسی حد تک سوئٹزرلینڈ میں بھی نظر آتا ہے۔ لہٰذا ان ملکوں میں بھی قومیت کی تشکیل میں ان جغرافیائی عوامل کا بڑا موثر کردار رہا ہے۔

وحدانی نظام حکومت

آب و ہوا کی اس یکسانیت نے جہاں برطانوی قومیت کی تشکیل کی وہاں وحدانی نظامِ حکومت کے لیے بھی راہ ہموار کی۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا وسیع و عریض ملک وحدانیت سے مطابقت حاصل نہ کر سکا اور وہاں کامیاب وفاقیت کا تجربہ کیا گیا۔

معاشی عوامل

کسی بھی سیاسی نظام پر معاشی عوامل کتنے گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں ۸۰ فیصد ممالک صنعتی اعتبار سے انتہائی ترقی یافتہ ہیں۔[۲] ایک سیاسیات کا طالب علم بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ برطانیہ میں فلاحی مملکت کا قیام جمہوری اداروں کے استحکام میں کس قدر معاون ثابت ہوا۔ لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد سے مختلف مغربی اور ایشیائی ملکوں کے برطانوی منڈیوں پر قبضہ کرنے سے برطانیہ کا تجارتی توازن متاثر ہوا۔ جس کے نتیجہ میں فلاحی مملکت کے متعدد منصوبے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان معاشی مسائل نے آنے والی حکومتوں کے لیے مشکلات پیدا کیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد برطانیہ کی دونوں بڑی جماعتوں میں سے کوئی بھی ۵۰ فیصد یا اس سے زائد ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ نیز ان جماعتوں کی کامیابی و ناکامی کا انحصار بھی بہت کچھ ان کے معاشی پروگراموں

---

[۱] بحوالہ صفحہ ۳۲ ۔ انٹروڈکشن ٹو پولیٹیکل سائنس مصنفین روڈی ۔ اینڈرسن ۔ کرسٹل اور گرین ۔

[۲] انالائزنگ امریکن پالیٹکس ۔ صفحہ ۴۴ ۔ مصنف: ڈبلیو روزن بام ۔ جان اسپینر ۔ ڈبلیو برلیس ۔

سے متعلق رہا۔ ۱۹۷۴ء کے انتخاب میں کنزرویٹو پارٹی اپنی سمندر پار تجارت میں ناکامی کی وجہ سے ہار گئی لیکن ۱۹۸۳ء میں وہ اپنی بہترین معاشی حکمتِ عملی کی وجہ سے دوبارہ جیت گئی۔

شہری اور دیہی آبادی کی تقسیم کے اعتبار سے انگلینڈ اور ویلز میں عوام کی ۷ء ۷۷ فیصد آبادی شہروں میں آباد ہے بہ مقابلہ امریکہ جہاں ۲ء ۷۹ فیصد لوگ شہروں میں رہتے ہیں، جن میں ۱۲ فیصد لوگ کاشتکاری کرتے ہیں اور ۳۰ فیصد صنعت سے متعلق ہیں، جبکہ برطانیہ میں صرف ۴ فیصد لوگ کاشتکاری کرتے ہیں اور ۴۸ فیصد کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔

گویا برطانیہ میں ہر تین ووٹوں میں سے دو ووٹ مزدور طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں وہ سیاسی جماعت اقتدار میں آسکتی ہے جو مزدوروں کے لیے خاص اپیل حاصل کرے۔ جب کہ امریکہ میں سیاسی جماعتیں بیک وقت مزدور، کاشتکار، متوسط طبقہ اور صنعت کاروں کے لیے ترغیبات رکھنے پر مجبور ہیں۔

قدرتی وسائل کی کمیابی اور برطانوی خارجہ پالیسی

صنعتی ضرورت کی تکمیل کے لیے برطانیہ کو ماسوائے کوئلہ یا خام لوہے کے قدرتی وسائل کی کمیابی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ لہٰذا اپنی ضروریات کا بیشتر حصہ وہ یا تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ، دولتِ مشترکہ کے ممبر ملکوں اور دیگر ملکوں سے حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اقتصادی مفادات کی حفاظت برطانیہ کی خارجہ پالیسی کا مرکزی نقطہ نظر آتا ہے۔ لہٰذا جب کبھی اس کے اقتصادی مفادات خطرہ میں پڑتے ہیں، برطانوی لبرلزم یا انسانی حقوق کے سب دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس کی اچھی مثالیں ہیں ۱۹۵۶ء میں نہر سویز یا ۱۹۸۵ء جزائر خاک لینڈ کے واقعات۔ سقوط ڈھاکا یا مسئلہ فلسطین میں اسرائیل کی درپردہ پشت پناہی کو انھیں اقتصادی مفادات کی تکمیل سمجھنا چاہیے۔

لیکن برطانیہ میں معاشی عنصر کی اہمیت کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ قوم امریکیوں کے مقابلے میں کم مادیت پرست ہے۔ انگریز بنیادی اعتبار سے قوم پرست ہے اور انفرادی مفادات کو ہر اجتماعی مفاد پر قربان کر سکتا ہے۔

مفکرینِ اسلام

مصنفہ

مولانا عبداللہ قدسی

صفحات: ۱۶۳ — قیمت: ۲۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی نمبر ۱

رفتارِ ادب

(تبصرہ کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

ضیائے بدر

از : سیّد بدر عالم بدؔر

۱۹۸۶ء صفحات: ۱۳۶ — قیمت : ۴۰ روپے

ناشر : میکو ـ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶۸، اسلام آباد ـ فون : ۸۱۰۳۵۱

"ضیائے بدر" سیّد بدر عالم بدؔر کا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں کچھ نظمیں ہیں اور کچھ غزلیں۔ بدر عالم بدؔر ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ اسی لیے زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے ہوئے بھی وہ کسانوں پر سختی کرنے کو روا نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کی مظلومیت اور بے چارگی کو دیکھ کر ان کا دل تڑپ اٹھتا تھا۔ وہ اپنی ہی برادری کو مخاطب کر کے نہایت بلند آہنگی سے کہتے ہیں :

اے زمیندار وا انھیں نیچا دکھا سکتے نہیں   توڑ سکتے ہو انھیں لیکن جھکا سکتے نہیں
ختم کر دو ختم یہ سرمایہ داری کا رواج   کیا کروں بھائے نہیں مجھ کو عصا و تخت و تاج

عجیب بات یہ ہے کہ جب یہ صدا بلند ہوئی اس وقت تک ترقی پسند تحریک شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بدر عالم ترقی پسندی کی طلوعِ سحر کے لیے نجم سحر ثابت ہوئے۔

انھوں نے کسانوں کے علاوہ دوسرے دکھی اور مظلوم انسانوں کے ساتھ بھی اظہارِ ہمدردی کیا ہے۔ اور ان کے دکھوں کو دور کرنے کے لیے تجاویز پیش کر کے گویا ایک مثبت رویّہ اختیار کیا ہے جیسا کہ ان کی نظموں، بیوہ اور مزدور سے ظاہر ہوتا ہے۔

غزلوں میں بھی بدؔر صاحب کا اپنا ایک منفرد انداز ہے۔ اُن کے کلام میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کی نمود ہے۔ اُن کا رنگ و آہنگ بھی سب سے جداگانہ ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو :

چھالوں نے پھوٹ پھوٹ کے پانی پلا دیا   کانٹوں سے پوچھنا کہ تمھیں اب بھی پیاس ہے

بدر صاحب کی نظموں میں مناظرِ قدرت کا بیان بھی حسین ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے شعرا سے مختلف ہے۔ جیسے نظم بہ عنوان "برسات"۔ اُن کے کلام میں رومانیت بھی ہے لیکن بہت کم۔ وہ دراصل ایک حقیقت پسند شاعر ہیں جن کے یہاں شاعرانہ لطف کے ساتھ معنویت بھی بہ درجہ اتم موجود ہے۔ اور زبان و بیان کی متعدد خوبیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

ثناء الحق صدیقی

روشنی لہولہو ———

۱۹۸۶ء

مرتب : احمد پراچہ

صفحات: ۱۲۸ — قیمت: ۱۵ روپے

زیراہتمام : مستجاب پبلی کیشنز، کوہاٹ

جیسا کہ کتاب کے اندرونی سرورق پر مرقوم ہے، یہ کتاب حضرت امام حسینؓ کے حضور ادبا و شعرا کا نذرانۂ عقیدت ہے۔ اس میں سانحۂ کربلا سے متعلق اردو کے مختلف شعرا و شاعرات کی منظومات شامل ہیں۔ سب سے پہلی نظم مرزا غالب کی ہے جس کا عنوان "نذرِ حسین" ہے۔ اس کے بعد مولانا محمد علی جوہر، علامہ سیماب اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، مولانا ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری، احمد ندیم قاسمی وغیرہ جیسے مشہور سخن وروں کے تاثرات کو پیش کیا گیا ہے۔ سانحۂ کربلا سے متعلق جو روایات انیس و دبیر وغیرہ کے زمانے سے بیان ہوتی چلی آرہی ہیں اُن ہی کو بنیاد بنا کر اِن شعرا نے حضرت حسینؓ کے المناک واقعہ سے متعلق طرح طرح سے اپنے جذباتِ رنج والم کو پیش کیا ہے۔ ہر نظم سے خلوص و عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ مرتب کی کوشش لائقِ تحسین ہے کہ انھوں نے ان منظومات کو یکجا کر دیا ہے

ثناء الحق صدیقی

ہمدرد نونہال ———

خاص نمبر

مدیر اعلا : مسعود احمد برکاتی

مدیر اعزازی: سعدیہ راشد

صفحات: ۲۷۳ — قیمت: ۷ روپے

پتا : ہمدرد نونہال۔ ہمدرد۔ ڈاک خانہ ناظم آباد۔ کراچی

بچوں کے رسالوں میں ہمدرد نونہال کو بڑی اہمیت و خصوصیت حاصل ہے۔ اس میں افسانے، مضامین، معلوماتِ عامہ، نظمیں اور بہت سا دلچسپ مواد ہوتا ہے جو بچوں کی معلومات میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اُن کے لیے تفریح کا سامان بھی مہیا کرتا ہے۔ اس مرتبہ خاص نمبر نکال کر بچوں کے لیے ایک گراں قدر تحفہ فراہم کر دیا گیا ہے۔ اکثر مضامین نہایت مفید اور معلوماتی ہیں۔ کئی افسانے نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ بچوں کے لیے سبق آموز بھی ہیں اور بچوں کو بری باتوں سے نفرت دلانے میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً "آٹھویں سالگرہ، مضر چیزیں" مثلاً لال سپاری، چٹخارے دار املی اور کچے امرودوں کا نقصان بتا کر بچوں کو اُن سے پرہیز کرنے کی طرف راغب کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ رضیہ سلطانہ، سیاروں کی دنیا، نہایت معلوماتی ہیں۔ "السلام علیکم" سے بچوں کے اخلاق کی اصلاح مقصود ہے۔ "مسکراتے رہو" کے عنوان کے تحت جو لطیفے دیے گئے ہیں، وہ بھی اپنے اندر جدت و تازگی رکھنے کے ساتھ ساتھ بے حد لطف و انبساط کے حامل ہیں۔ نونہال ادیب کے ذریعہ بچوں کو لکھنے کی جانب راغب کرنے کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔ غرض اس خاص نمبر کے اکثر مضامین معیاری اور مفید ہیں پھر اتنا ضخیم پرچہ ہونے کے باوجود قیمت محض ۷ روپے۔ غرض یہ نمبر ایک اچھا تحفہ ہے جو ادارہ ہمدرد کی جانب سے پیش کیا گیا ہے۔

ثناء الحق صدیقی

برقِ تجلّے ———

۱۹۸۶ء

مصنف : پروفیسر حکیم بادشاہ حسین رعنا سندیلوی

صفحات: — قیمت: ۵۰ روپے

ناشر : حکیم میر احمد عثمانی۔ ۳۔بی، بلاک ایس۔ شمالی ناظم آباد۔ کراچی

"برقِ تجلّے" جناب رعنا سندیلوی مرحوم کا مجموعۂ کلام ہے۔ رعنا صاحب ایک مرنجاں و مرنج شخصیت کے مالک تھے جنھیں نام و نمود سے

دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ مشاعروں میں بھی وہ احباب کی دلجوئی کے خیال سے شرکت فرماتے تھے۔ وہ جناب معشوق حسین صاحب اطہر ہاپوڑی مرحوم کے شاگرد رشید تھے جن کو استاد نے اپنی حیات میں ہی فارغ الاصلاح کر دیا تھا۔ اور اجازت دے دی تھی کہ نو آموزوں کی اصلاحِ سخن کر سکتے تھے۔ رعنا صاحب حقیقت پسندانہ شاعری کے قائل تھے۔ اور ان کی شاعری مشاہدات اور تجربات کی عکاسی کرتی تھی۔ ندرتِ خیال اور حسنِ ادا داسلوبِ بیان ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ اور ایسی کہ ان کے کلام سے کہنہ مشقی نمایاں ہے۔ عام ڈگر سے ہٹ کر شعر میں ایک نئے ڈھنگ سے جان ڈال دیتے تھے۔ زندگی اور موت کے موضوع پر مختلف انداز میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ مگر انھوں نے اسی خیال کو یوں ظاہر کیا ہے۔

کیسے کہہ دوں کہ زندگی ختم ہو زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

خیال پرانا ہے لیکن طرزِ بیان میں جدّت ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مجموعہ کلام ایک اعلیٰ شعری مجموعہ ہے جس سے ذوقِ شعری کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ کتاب اچھی اور گیٹ اپ خوب ہے۔

توقیر صدیقی

جامِ سفال ــــــ

۱۹۸۵ء

مصنف : ابن الحسن

صفحات : ۱۲۰ ــ قیمت : ۳۰ روپے

پتا : قوس کمیونی کیشنز۔ میاں چیمبرز، ٹیمپل روڈ۔ لاہور

"شمع اور دریچہ" کے بعد محمد ابن الحسن سید کی دوسری کتاب "جامِ سفال" منظرِ عام پر آئی ہے۔ دونوں میں تحریر کی شگفتگی اور تازگی یکساں طور پر موجود ہے جو فرق ہے وہ یہ کہ اول الذکر کسی خاص موضوع سے متعلق نہیں لیکن آخر الذکر کا موضوع انسانی تضاد ہے جنھیں دنیا بھر کے شواہد و عوامل کے حوالے سے اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مثلاً جنگ، امن، دو بڑی طاقتوں کی آویزش، ایٹمی عہد کی عطا بے یقینی اور خوف وغیرہ۔

مصنف کو "جامِ سفال" لکھنے کی تحریک ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ابرار الحسن کے ان خطوط سے ہوئی جن میں انھوں نے تضادات کی بحث کرتے ہوئے "آں دم تا ایں دم" سفر کیا ہے۔ یعنی بات ہابیل قابیل سے شروع ہو کر آج کے زمانہ تک پہنچی ہے جو تاریخ وسیاست اقوام وملل پر اُن کی گہری اور دور رس نگاہ اور ان کا بھرپور مطالعے کا پتا دیتی ہے۔ انسانی تضاد کے سلسلے میں ایک نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ تضاد انسان کے اندر ہے۔ علما نے اسے ثنویت کا نام دیا ہے۔ جیتے جی اس سے چھٹکارا مشکل ہے۔ اور کسی دور کا بھی معاشرہ تضاد و تخالف سے یکسر پاک نہیں۔ ہاں اہل خیر نے اس میں توازن کی فضا قائم کی ہے۔ اسی توازن کی بدولت کوئی معاشرہ اچھا یا بہت اچھا کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ "جامِ سفال" میں اچھے معاشرے کی طلب اور تڑپ ملتی ہے، یہی اس کتاب کی خوبی ہے۔

ا۔س

قومی یکجہتی میں ادب کا کردار ــــ از : محسن بھوپالی

۱۹۸۶ء

صفحات : ۱۱۱ ــ قیمت : ۲۰ روپے

پتا : مکتبۂ فکر و نظر پہلی منزل ۳/۵ بلاک ۴-الف، ناظم آباد کراچی

محسن بھوپالی کی یہ کتاب دوسری اسی قبیل کی کتابوں سے اس لیے مختلف ہے کہ اس میں بہت سے اصحاب ادب سے، ادب کے کسی

ایک موضوع پر انٹرویو لیا گیا ہے۔ اس کا افادی پہلو یہ ہے کہ ہمیں اس کتاب کے توسط سے "قومی یکجہتی میں ادب کے کردار" پر مختلف النوع آرا پڑھنے کو ملی ہیں۔ محسن بھوپالی نے جو سوالیے مرتّب کیے ہیں ان سے قومی یکجہتی کے بارے میں ان کے اپنے مثبت فکر و نظر کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

میرے نزدیک انٹرویو میں سوالات کی بہت اہمیت ہے۔ یہ نہ صرف جواب دینے والے کے اندر تحریک پیدا کرتے ہیں بلکہ جواب کا رخ بھی متعین کرتے ہیں۔ اور یہ کام اس کتاب میں بہ خوبی انجام پایا ہے۔

"قومی یکجہتی میں ادب کا کردار"، میں جن ادیبوں نے اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ اُن میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر وزیر آغا، انعام درّانی، محشر بدایونی، ہاجرہ مسرور، افتخار جالب، مرزا عابد عباس، عالمتاب تشنہ، سحر انصاری اور جمیل یوسف کے نام نامی ہیں۔ یہ حضرات مختلف ادوار، جدا نقطہ ہائے نظر اور الگ الگ شعبہ زندگی و فن سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ہر طرح کی نمائندگی ہو جاتی ہے۔ اگر انٹرویو کا حلقہ اور وسیع ہوتا تو اچھا تھا۔

ا۔ س

سحرِ حلال (مصوّر)

۱۹۸۵ء

مصنف : شہاب الدین رحمت اللہ

صفحات : ۲۱۲ ـــ قیمت : ۴۰ روپے

پتا : بی ۔ ون "سالیما فلیٹ، خیابانِ جامی۔ کلفٹن کراچی

شہاب الدین رحمت اللہ پر بات کرتے ہوئے ذہن میں ان کی شخصیت کی تین سطحیں ابھرتی ہیں، مصوّر، مترجم اور شاعر ـ یہاں پہنچ کر آدمی یہ سوچنے لگتا ہے کہ ان کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں میں سے کس کو کس پر فوقیت ہے، فیصلہ اس لیے مشکل ہو جاتا ہے کہ بڑائی ان سب میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔

شہاب صاحب کی تصانیف میں خواہ "رِٹن جمس فرام غالب (۱۹۳۳ء)" ہو، "آرٹ اِن اردو پوئٹری" (۱۹۵۵ء) ہو یا "ہنڈرڈ جمس فرام غالب" (۱۹۸۰ء)، سب سے ان کے اس بڑائی کی تصدیق ہوتی ہے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان تصانیف کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اوراق میں مصوّری، ترجمے کی بلند معیاری اور ستھرا ذوقِ شعری شانہ بہ شانہ چلتے ہیں۔

شہاب صاحب نے فنِ مصوّری بیرسٹری کے ساتھ آکسفورڈ کے مشہور آرٹ اسکول "رسکن اسکول آف ڈرائنگ" سے سیکھا۔ اور پھر اپنی ذہانت سے اس فن میں انفرادیت کی وہ شان پیدا کی کہ عبدالرحمٰن چغتائی کو بھی سراہنا پڑا۔

انگریزی میں منظوم ترجمے کے لیے غالب جیسے شاعر کا انتخاب بذاتِ خود شہاب صاحب کے اعلیٰ شاعرانہ ذوق کی دلیل ہے۔ ان کی کتاب "آرٹ ان اردو پوئٹری"، کے دیباچہ میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے نہایت اچھے الفاظ میں ترجمے کی تعریف کی ہے۔

"نظم کا نظم میں ایسا ترجمہ کرنا کہ مفہوم میں فرق نہ آنے پائے اور اصل کی خوبی اور زورِ بیان قائم رہے" نہایت دشوار ہے ....

شہاب صاحب نے ایک ایسے خانوادے میں آنکھیں کھولیں جہاں علم و ادب کا شب و روز چرچا تھا۔ جس کا ایک بہت ہی اہم نام "کاشف الحقائق"، کے مصنف سیّد امداد امام اثر ہیں خود ان کے غیر معمولی ہونے کی گواہی، آئی سی ایس میں کامیابی اور بیرسٹری کی تکمیل ہے۔

"سحرِ حلال" شہاب صاحب کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔ اس میں زیادہ غزلیات شامل ہیں، جن میں اکثر کسی نہ کسی کی زمین میں کہی گئی ہیں۔

صاحب کتاب نے عمر بھر غالب کو اس طرح چاہا اور اپنی شاعری و مصوّری میں اسے ۱۵۸۱ بنا کے رکھا کہ لا محالہ ان کے مزاجِ شعری میں غالب کے اثرات داخل ہو گئے ہیں، کہیں لہجے میں کہیں الفاظ کی نشست و برخواست میں کہیں فکری سطح پر۔

"سحرِ حلال" کی پروف ریڈنگ کا غیر محتاط انداز کسی قدر کھٹکتا ہے۔

(ا۔س)

ماہنامہ قومی بینکاری

ایڈیٹر : جمیل احمد صدیقی

(جمیل نشتر کی یاد میں)

ضخامت : ۹۸ — قیمت

پتا : شعبۂ تعلقاتِ عامہ نیشنل بینک آف پاکستان۔ صدر دفتر کراچی

جمیل نشتر مرحوم ایک لائق باپ کے قابل فرزند تھے۔ ان کے والد سردار عبد الرب نشتر، جن کی ذات پر پاکستانی قوم جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ نہ صرف عہدے اور مرتبے کے اعتبار سے ایک بڑے انسان تھے بلکہ ذاتی طور پر شرافت و انسانیت کا ایک اعلیٰ پیکر بھی تھے۔ جمیل نشتر نے ایک طرف یہ خوبیاں اُن سے ورثہ میں پائی تھیں تو دوسری طرف والدین کی بہترین تربیت نے ان کے کردار کو نکھارا اور سنوارا تھا۔ چنانچہ وہ ایک طرف تہذیب و شائستگی اور حُسنِ اخلاق کے مجسمہ تھے تو دوسری طرف محنت و مستعدی، خدمتِ خلق اور انسانی ہمدردی کے جذبہ سے بھی سرشار تھے۔ ان خوبیوں نے جہاں انھیں اعلیٰ مناصب پر پہنچا دیا وہیں انھوں نے لوگوں کے قلوب کی گہرائیوں میں بھی اپنے لیے جگہ پیدا کر لی۔ وہ نیشنل بینک کی صدارت پر یکم فروری ۱۹۷۲ء سے ۵ نومبر ۱۹۷۸ء تک یعنی تقریباً ۷ سال فائز رہے اور انتقال سے ۸ سال پہلے اس عہدے سے سبکدوش ہو چکے تھے لیکن اس بینک کا ہر فرد آج بھی اُن کے غم میں اشک بار ہے۔ اور اپنے اسی تعلقِ خاطر کے اظہار کے لیے بینک کے اربابِ حل و عقد نے قومی بینکاری کا یہ شمارہ اُن کی یاد میں نکالا ہے۔ اس میں جہاں ملک کے بہترین لکھنے والوں نے مضامین لکھ کر مرحوم کے بارے میں اپنے دلی جذبات اور قلبی تاثرات کا اظہار کیا ہے، وہاں اس نمبر کو صورتِ ظاہر کے اعتبار سے بھی بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ مضامین کو پڑھ کر جہاں جمیل نشتر مرحوم کی خوبیوں کا پتا چلتا ہے، وہاں لکھنے والوں کی اُن سے بے پایاں محبت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ کاش لوگ اس نذرانۂ عقیدت کو دیکھ کر اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ نیکی، شرافت، حُسنِ اخلاق اور محبت و ہمدردی کی کتنی قوت ہے کہ اس کے سہارے انسان مرنے کے بعد بھی لوگوں کے قلوب میں زندہ رہتا ہے۔

ثناء الحق صدیقی

مضمون صاف اور خوش خط — اور کاغذ کے ایک طرف لکھیں

گرد و پیش

نیپال میں اردو

پڑوسی اور دوست ملک نیپال کے دار الحکومت کٹھمنڈو میں اردو اور نیپالی زبانوں کو قریب لانے اور دونوں قوموں کے درمیان رابطہ گہرا کرنے کے لیے حال ہی میں "انجمن ترقی اردو نیپالی زبان و ادب" کے نام سے ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا بڑا مقصد یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام شعر و ادب کے وسیلے سے ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ سمجھ سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انجمن کے مقاصد میں اردو، نیپالی کے باہمی ترجموں کے علاوہ ایک اردو نیپالی لغت کی اشاعت کا اہتمام بھی شامل ہے۔ یہاں کے ایک مشہور ادیب اور شاعر ڈاکٹر دیوندر راج اپادھیائے نے فیض احمد فیض کے منتخب کلام کا نیپالی میں ترجمہ کیا جو حال ہی میں کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کی تقریبِ رونمائی کا اہتمام انجمن ترقی اردو نیپالی زبان و ادب، کے تحت گزشتہ دنوں بالمیکی کیمپس میں کیا گیا۔ جو سنسکرت یونیورسٹی بھی کہلاتا ہے۔

تقریب کی صدارت پروفیسر کھدجامان مالانے کی جو نیپال پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہیں اور شعر و ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں اردو سے انھیں خاص شغف ہے۔ مہمانِ خصوصی جناب کیدار مان ویدتھ تھے۔ جناب کیدار نیپال کے ان چند گنے چُنے شعرا میں سے ہیں جن کی شاعری اُن کی زندگی ہی میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ نیپال کے تمام ادیب و شاعر ان کے تجربے اور قابلیت کا احترام کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف کابینہ کے وزیر رہ چکے ہیں بلکہ رائل نیپال اکیڈمی کے پہلے چانسلر ہونے کا اعزاز بھی انھیں حاصل ہے۔ ورنہ اس سے پہلے اکیڈمی کا چانسلر خود راجہ ہوا کرتا تھا۔ شاہ بریندرا نے کیدار مان ویدتھ کے علمی و ادبی مرتبے کے اعتراف کے طور پر یہ عہدہ اُن کے سپرد کیا۔ تقریب کے ایک معزز مہمان نیپال میں پاکستانی سفیر جناب محمد ابوالفضل تھے۔ جناب ابوالفضل کی مساعی سے گزشتہ دو تین سال میں یہاں اردو کی مقبولیت بہت بڑھ گئی ہے۔ موصوف کی انتھک کاوشوں سے تری بھون یونیورسٹی کٹھمنڈو میں پہلی بار شعبۂ اردو کا قیام عمل میں آیا۔ نیز انٹرنیشنل لینگویج کیمپس میں بھی اردو کو شامل کیا گیا۔ فیض کا ترجمہ آپ ہی کی نگرانی میں ہوا ہے۔ اسٹیج سکریٹری کے فرائض پروفیسر شیلندر کمار سنگھ نے انجام دئے۔ پروفیسر شیلندر کمار نیپالی، ہندی اور انگلش تینوں زبانوں میں شاعری کرتے اور مضامین لکھتے ہیں۔ لکھنؤ میں ہونے والی ترقی پسند تحریک کی پچاسویں سالگرہ میں نیپال کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ اردو سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ انجمن کا قیام دراصل شیلندر کمار کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہے۔ وہ انجمن کے جنرل سکریٹری بھی ہیں۔ سفیر پاکستان نے اپنی مختصر سی جامع تقریر میں فیض کو ایک ایسی شمع قرار دیا جس سے نئی نسل نے اپنی شمعیں روشن کی ہیں اور اردو ادب میں اُجالا کیا ہے۔ انھوں نے نیپالی ترجمہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایسی کوششیں جاری رہنی چاہئیں۔ اور نیپالی شعر و ادب کا بھی اردو میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ اس طرح دونوں قومیں ایک دوسرے کے قریب آئیں گی اور دلوں کے رابطے بڑھیں گے۔ مہمانِ خصوصی جناب کیدار مان ویدتھ کی تقریب بے حد دل کش اور تمام تر ادبی حُسن سے آراستہ تھی۔ انھوں نے کہا کہ فیض صرف پاکستان ہی کا شاعر نہیں، ساری دنیا کا شاعر ہے۔

انھوں نے فیض کو میر، غالب، اقبال کے بعد سب سے بڑا شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ فیض کی شاعری بیک وقت زندگی کے دکھوں اور خوشیوں کی شاعری ہے۔ وہ ترقی پسند ہے مگر پروپیگنڈہ کی فضا سے آزاد ہے۔ انھوں نے فیض کی شاعری کی خصوصیات بتائیں اور مثال کے طور پر چند اشعار سنائے۔ انھوں نے فیض کی انسان دوستی کو کائناتی کہا اور اسے سراہا۔

جناب صدر کھدجامان مالانے بھی فیض کو بین الاقوامی شاعر قرار دیا اور کہا کہ سچ تو یہ ہے کہ "جہاں نہ پہنچے ردی وہاں پہنچے کوی"، یعنی شاعر کسی زبان کا بھی ہو، ابلاغ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ شاعری دراصل دلوں کا رابطہ ہے۔ اور فیض کی شاعری میں جو خوبصورتی، نغمگی اور دلوں کو چھو لینے والا پیغام ملتا ہے۔ وہ صرف پاکستان یا اُردو ہی کا نہیں، ہر قوم اور ہر زبان کا سرمایہ ہے۔ تقریب کے اختتام پر نیپال ٹی وی اور ریڈیو کی مشہور گلوکارہ گیا نورانا نے اپنی خوبصورت آواز میں فیض کی دو غزلیں سنائیں اور اُردو نہ سمجھنے والے بھی مسحور ہو گئے۔ بعد ازاں مہمانوں کی چائے اور ناشتہ سے تواضع کی گئی۔ اس طرح کٹھمنڈو کی سرزمین پر اُردو کے حوالے سے منائی جانے والی یہ پہلی تقریب کامیابی سے اختتام پذیر ہوئی۔ اور ادبی حلقوں میں کافی دنوں تک اس کا چرچا رہے گا۔

(رپورٹ:۔ ڈاکٹر طاہرہ نکہت)

سعودی عرب میں اردو کی پہلی کتاب

سعودی عرب سے اردو زبان میں شائع ہونے والی اوّلین کتاب "پیکرِ نغمہ" چھپ کر منظر عام پر آگئی ہے۔ اور اوّلین اردو کتاب کا یہ اعزاز ممتاز پاکستانی شاعر نعیم حامد علی اور معروف ادارہ نشر و اشاعت "دار العلوم" نے حاصل کیا ہے۔ اس مجموعۂ کلام کو مقامی اُردو حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

"پیکرِ نغمہ" کے مصنف نعیم حامد علی گزشتہ ۲۳ برسوں سے سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ جگر مراد آبادی کے نواسے ہیں۔ اور یہاں کے پہلے اُردو شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

پیکرِ نغمہ نعیم حامد علی کے فن و شخصیت پر برصغیر پاک و ہند کے جن اہلِ قلم حضرات نے اظہارِ خیال کیا ہے اُن میں جناب حامد الانصاری غازی، جناب سیّد ضمیر جعفری اور مصطفٰے علی قدوائی کے نام نامی قابلِ ذکر ہیں۔

نعیم حامد علی، ممتاز عربی شعراء کے کلام کے ترجمے اور ان کے شخصی خاکوں پر مبنی ایک کتاب بھی مرتب کر رہے ہیں۔ انھوں نے میر تقی میر کے فن پر بھی تحقیقی کام کا آغاز کیا ہے

رپورٹ:۔ شاہد نعیم ۔ جدہ

دفتری اُردو سیکھنے کے بارے میں گورنر سندھ کی ہدایت

گورنر سندھ لفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) جہانداد خاں نے سرکاری ملازمین کو ہدایت کی ہے کہ وہ علّامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے دفتری اُردو خط و کتابت کا کورس کریں تاکہ اُردو کو سرکاری زبان بنانے کی پالیسی پر عمل درآمد اور قومی زبان کے فروغ میں مدد مل سکے۔ دریں اثنا حکومت سندھ کے سروسز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن کے محکمے کی جانب سے بھی سرکاری محکموں کو ایک سرکلر جاری کیا گیا ہے جس میں اُردو خط و کتابت کا کورس سیکھنے والے ملازمین کے نام طلب کیے گئے ہیں۔

جنگ ۲۶ نومبر ۱۹۸۶ء

غالب ایوارڈ کا اعلان

۱۹۸۵ء کے غالب ایوارڈ حاصل کرنے والی آٹھ ادبی شخصیتوں کے ناموں کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ان میں اردو کی مشہور ناول نگار صالحہ عابد حسین، اخبار کے ایڈیٹر احمد سعید ملیح آبادی اور ناول نگار ایم۔ ایم راجندر شامل ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے جنرل سکریٹری محمد شفیع قریشی نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں غالب ایوارڈ حاصل کرنے والوں کے ناموں کا اعلان کیا ہے۔ ایوارڈ جو نقد رقم اور توصیف ناموں پر مشتمل ہیں، اگلے مہینے دیے جائیں گے۔ جن دوسرے اصحاب کو ایوارڈ ملے ہیں اُن میں نثر کے لیے کشمیر لال ذاکر، نظم کے لیے اختر انصاری، تنقید کے لیے نورالحسن ہاشمی، مزاح کے لیے رضا نقوی واہی اور خطاطی کے لیے ابوجعفر زیدی شامل ہیں۔

——— روزنامہ جنگ، کراچی

یونیورسٹیوں میں تحقیق کی معیار بندی

ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ ہر سال جنوری کے آخری ہفتہ میں چند دن اپنے بانی اور عظیم محقق قاضی عبدالودود مرحوم کی یاد کے لیے وقف کرتا ہے۔ اس سال سے دو دو یادگاری خطبات کے اعلان کے ساتھ ایک اور اہم پروگرام بھی شروع ہوگا۔ یعنی یونیورسٹیوں میں پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کے کاموں کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس طرح ہر سال ایک درجن کے قریب جائزے بھی سامنے آتے رہیں گے۔ یاد رہے کہ یہ سلسلہ خود قاضی عبدالودود مرحوم نے شروع کیا تھا۔ اور دانش گاہوں میں تحقیقی کام کے عنوان سے کئی تھیسس ان کے تفصیلی مقالہ کا موضوع بنے تھے۔ انھوں نے اختر اورینوی کے تھیسس کا جائزہ لیا تھا جس کا عنوان تھا "بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا" دوسرا جائزہ ڈاکٹر ممتاز احمد کے تھیسس کا لیا گیا تھا جو "مثنویات راسخ" پر تھا۔ تیسرا جائزہ ڈاکٹر حسنین کے تھیسس کا تھا۔ اس تھیسس کا موضوع تھا۔ فدوی اور ان کا کلام۔ قاضی صاحب نے ان تین کے علاوہ دو جائزے اور بھی لیے تھے۔ ایک ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے تھیسس کا عنوان تھا "دہلی کا دبستانِ شاعری" اور اسی طرح ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے تھیسس کا جس کا عنوان تھا لکھنؤ کا دبستانِ شاعری۔

قاضی صاحب کے بنا کردہ ادارہ کی طرف سے اسی طرح کے معیار کو آگے بڑھانے کے لیے اگر یہ کام سال بہ سال پابندی سے ہوتا رہے اور اچھے لوگ اس میں حصہ لیتے رہیں تو امید ہے دانش گاہوں میں ریسرچ کا معیار بلند ہو سکے گا۔ اس کے لیے اس خبر کے ذریعہ تمام جامعات کے ذہین اساتذہ کو دعوت فکر دی جا رہی ہے۔ جو مقالے ادارہ تحقیقات اردو (خدا بخش لائبریری کے توسط سے) دسمبر کے اواخر تک پہنچ جائیں گے یا کم سے کم ان کی اطلاع موصول ہوگی انھیں اس افتتاحی اجلاس میں جو جنوری ۸۷ء میں ہوگا شامل کیا جائے گا۔

امید ہے جنوری ۸۷ کا یہ اجلاس اس لحاظ سے تاریخ ساز اجلاس ثابت ہوگا۔

——— خدا بخش رپورٹ

یومِ اقبال

انجمن ترقی اردو خواتین پاکستان کے زیر اہتمام خواتین کلب کراچی میں بتاریخ ۱۳ر نومبر بدھ شام ۴ بجے یوم اقبال کا ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا جس میں اراکین انجمن کے علاوہ دیگر خواتین نے بھی شرکت کی۔ صدارت محترمہ بیگم محمد شریف صاحبہ نے کی۔

مہمان خصوصی کے فرائض بیگم ظلِّ احمد نظامی نے ادا کیے۔ جلسہ کی ابتدا تلاوتِ کلام پاک سے ہوئی۔ تلاوت بیگم ملک صاحبہ نے کی۔ حمد باری تعالیٰ خورشید بانو شمع صاحبہ نے پیش کی۔ اس کے بعد نعت رئیسہ قریشی صاحبہ نے نہایت سوز و گداز کے ساتھ پیش کی۔ بعد ازاں بیگم حسن نے نعتیہ کلام پڑھا۔ نعتیہ کلام کے بعد ایک نہایت خوبصورت ٹیبلو اقبال کی دعا پر ہوا جس میں شاہین عثمانی عظمیٰ، سعدیہ، ارم، فاطمہ، شائستہ، لبنیٰ اور عظمیٰ نے شرکت کی۔ بعد ازاں صدر جلسہ بیگم محمد شریف صاحبہ نے اقبال کے پیغام اتحاد، نظم اور یقین محکم پر نہایت جامع تقریر کی۔ آپ نے فرمایا، یہ وہ بنیادی پیغام ہے جس پر کاربند ہو کر قومیں ترقی کی راہوں پر گامزن ہوتی ہیں۔ آج ہم نے اس پیغام کو بھلا دیا ہے۔ اسی لیے ہماری قوم انتشار کا شکار ہے۔ آپ کے بعد رئیسہ قریشی صاحبہ نے اقبال کی ایک نظم "کبھی اے حقیقتِ منتظر...." ترنم کے ساتھ پیش کی۔ نظم کے بعد مہمان خصوصی بیگم ظلِّ حسن نظامی صاحبہ نے تقریر کی کہ آج بھی ہمیں اقبال کے افکار و تصوّرات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ آج بھی کلامِ اقبال ہماری قوم کے لیے مہمیز کا حکم رکھتا ہے۔ اس کے بعد محترمہ سیدہ عثمانی صاحبہ نے نہایت مدلل تقریر کی اور اقبال کے فلسفۂ حیات پر روشنی ڈالی۔ آخر میں سب نے مل کر قومی ترانہ عقیدت کے ساتھ پیش کیا۔ اور یوں یہ رنگارنگ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

بیگم خورشید بانو شمع

معتمدِ اعلیٰ انجمن ترقی اردو خواتین پاکستان مرکزیہ کراچی

ذوالفقار احمد تابش کی نئی کتاب "جوار بھاٹا"

شاعر ادیب اور مصوّر جناب ذوالفقار احمد تابش کی نئی کتاب "جوار بھاٹا" کے نام سے چھپ گئی ہے۔ اسے مقبول اکیڈمی لاہور نے شائع کیا ہے۔

سری لنکا کے پس منظر میں لکھی گئی یہ سفری داستان پہلے قسط وار "اوراق" میں چھپتی رہی ہے اور اسے پاکستان اور بھارت میں پڑھنے والوں اور لکھنے والوں میں بہت مقبولیت حاصل رہی ہے۔

"نیاز فتح پوری احوال و آثار"

آنسہ عقیلہ شاہین کو کراچی یونی ورسٹی نے ان کے تحقیقی کام "نیاز فتح پوری احوال و آثار" پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری دی ہے۔ عقیلہ شاہین شعبۂ اردو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں لکچرار ہیں اور انھوں نے پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نگرانی میں اپنا تحقیقی کام مکمل کیا ہے۔

تحسین فراقی کے لیے ڈاکٹریٹ کی سند

مشہور نقاد تحسین فراقی کو پنجاب یونیورسٹی نے ان کے مقالے "مولانا عبدالماجد دریابادی حالات و آثار" پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔ اس مقالے میں مولانا دریابادی کی مبسوط سوانح کے ساتھ ان کی علمی، ادبی اور دینی خدمات کا مفصّل جائزہ بھی ہے۔ واضح رہے کہ تحسین فراقی پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے شعبۂ اردو میں استاد ہیں اور ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "جستجو" شائع ہو چکا ہے۔

ردِعمل

مشتاق شاد

ریاض ۔ سعودی عرب

جولائی کا "قومی زبان" ملا۔ شکریہ۔ اپنے بزرگ اور محترم دوست ڈاکٹر فہیم اعظمی کے ہمت بندھانے پر کچھ "جسارت" کر رہا ہوں۔ میں تقریباً ۲۲ سال کی مسلسل غیر حاضری کے بعد شاعری کے میدان میں دوبارہ قدم رکھ رہا ہوں۔ اور یہ بھی صرف ڈاکٹر صاحب جیسے ادب نواز دوستوں کے سبب ممکن ہوا۔

میرا اصل میدان لوک گیتوں کے منظوم تراجم کرنا ہے۔ میں لوک گیت کا اس کے لفظی اعتبار سے ترجمہ نہیں کرتا، بلکہ اس کے ماحول، روح اور ان جذبات کو ترجمے کا روپ دیتا ہوں جن میں ڈوب کر وہ لوک گیت اچانک کسی الھڑ مٹیار کے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر گاؤں کی اداس اور سنولائی ہوئی رات میں خوشبوؤں کے چراغ جلا دیتا ہے۔

آج سے ۲۲ سال پیشتر تک میرے کیے ہوئے لوک گیتوں کے تراجم، تسلسل سے، پاکستان کے چیدہ چیدہ ادبی رسائل میں طبع ہوتے رہے ہیں، جن میں افکار، نقوش اور ماہِ نو بھی شامل ہیں۔

ذاکر نسیم

کراچی

"قومی زبان"، کا قدرت اللہ شہاب نمبر نظر سے گزرا۔ شہاب صاحب نے ادب کے حوالے سے جو خدمات انجام دی ہیں اس سلسلے میں "قومی زبان"، نے یہ نمبر شائع کر کے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کی زندگی ہی میں ان کے کارناموں اور تخلیقات کے سلسلے میں کوئی مبسوط کتاب، یا کسی رسالے کا نمبر شائع ہوتا۔ قدرت اللہ شہاب نے رائٹرز گلڈ اور انجمن ترقی اردو پاکستان کی تنظیم اور ترتیب میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ان پر باقاعدہ تحقیقی کام ہو۔ اس مُردہ پرست معاشرے میں کسی کا توقیر و احترام ان کی زندگی میں کرتے ہوئے ہمارے دل دہل جاتے ہیں۔ خیر "قومی زبان"، نے یہ نمبر شائع کر کے ایک ایسا کام انجام دیا ہے کہ آنے والی نسل ان کے کارناموں سے آشنا ہو سکے گی۔

اس نمبر میں قدرت اللہ شہاب مرحوم سے متعلق کم سے کم اتنا مواد ضرور یکجا ہو گیا ہے کہ ان کے قاری یا ان پر کام کرنے والے ادھر ادھر بھٹکنے سے بچ جائیں گے۔

حروفِ تازہ

کتابیں

تاریخ اور فرقہ واریت — مصنف: ڈاکٹر مبارک علی
صفحات: ۱۴۴ — قیمت: ۲۰ روپے
پتا: نگارشات ۴ - بیگم روڈ، لاہور (پاکستان)

طشتِ مراد — مصنف: سید سبط علی صبا، مرتب: قاضی عارف حسین
صفحات: ۱۱۲ — قیمت: ۲۵ روپے
پتا: مجلسِ تصنیف و تالیف ۲۰ - ایف/۲۲۰، واہ کینٹ لاہور

مہران نقش — مصنف: ڈاکٹر وفا راشدی
صفحات: ۲۳۲ — قیمت: ۵۰ روپے
پتا: مکتبہ اشاعتِ اردو - الیف، ۲۷ ٹی اینڈ ٹی کالونی ملیر ہالٹ کراچی ۲۷

مولانا شبلی نعمانی - ایک مطالعہ — مصنف: مفتون احمد
صفحات: ۱۳۵ — قیمت: ۳۰ روپے
پتا: مکتبہ اسلوب، پوسٹ بکس ۲۱۱۹ - کراچی ۱۸ (پاکستان)

فیضانِ فیض — مصنف: ابوسعید قریشی
صفحات: ۱۸۴ — قیمت: ۳۵ روپے
پتا: مکتبہ اسلوب، پوسٹ بکس ۲۱۱۹ - کراچی ۱۸ (پاکستان)

سر سید احمد خاں — مصنف: قاضی عارف حسین
شخصیت اور فن
صفحات: ۹۵ — قیمت: ۱۰ روپے
پتا: شعبۂ تصنیف و تالیف، سرسید کالج واہ کینٹ (پاکستان)

آبشار — مصنف: مضمر تاتاری
صفحات: ۹۶ — قیمت: ۲۵ روپے
پتا: مکتبہ ارژنگ، پوسٹ بکس ۳۲۳ پشاور (پاکستان)

افرو ایشیائی ادیبوں کے مسائل ــــــ مصنّف : نقاش کاظمی

صفحات : ۹۶ ـ قیمت : ۱۲ روپے

پتا : پاکستان بک سیلنگ کارپوریشن، بہادر آباد کراچی (پاکستان)

میری نظمیں میرے گیت ــــــ مصنفہ : صائمہ خیری

صفحات : ۲۲۸ ـ قیمت : ۵۰ روپے

پتا : دفتر عصمت، الاکو ہاؤس ـ کراچی ۳ (پاکستان)

یادگارِ ایوب قادری ــــــ مرتّب : ثناء الحق صدیقی

صفحات : ۳۳۶ ـ

پتا : ادارہ دانش و حکمت ـ ڈی ۱۳ ـ بلاک بی، نارتھ ناظم آباد کراچی

بے جواز ــــــ مصنّف : حامد سروس

صفحات : ۱۷۶ ـ قیمت : ۴۰ روپے

پتا : پاک ڈائجسٹ پبلی کیشنز، ۲۷ بی وحدت کالونی، لاہور ۱۲ (پاکستان)

اعترافِ سخن ــــــ مصنّف : احمد پراچہ

صفحات : ۱۷۶ ـ قیمت : ۴۰ روپے

پتا : مستجاب پبلی کیشنز، محلہ پراچگان کوہاٹ (پاکستان)

جوار بھاٹا ــــــ مصنّف : ذوالفقار احمد تابش

صفحات : ۳۴۴ ـ قیمت : ۵۰ روپے

پتا : مقبول اکیڈمی ـ لاہور (پاکستان)

فورٹ ولیم کالج ــــــ تالیف : پروفیسر سید وقار عظیم، ترتیب : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

صفحات : ۲۴۸ ـ قیمت : ۴۵ روپے

پتا : یونیورسل بکس، ۴۰ اے ـ اردو بازار لاہور (پاکستان)

موجِ واپسیں ــــــ مصنّف : جبریل صدیقی

صفحات : ۱۱۲ ـ قیمت : ۳۰ روپے

پتا : مجلس مصنفین حیدرآباد، پوسٹ بکس ۴۳ حیدرآباد سندھ (پاکستان)

جریدے

نقوش

مدیر : جاوید طفیل

صفحات: ۴۴۰ ـ قیمت : ۶۰ روپے

پتا : ادارہ فروغِ اردو ، لاہور (پاکستان)

کتاب نما

مدیر : ولی شاجہاںپوری شاہد علی خاں

صفحات: ۷۲ ـ قیمت : ۳/۵۰ روپے

پتا : جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ (بھارت)

اوراق (خاص نمبر)

مدیران : وزیر آغا، سجّاد نقوی

صفحات: ۴۸۰ ـ قیمت : ۴۰ روپے

پتا : دفتر اوراق، چوک اردو بازار لاہور (پاکستان)

زبان و ادب سہ ماہی

مدیر : محمد یونس

صفحات: ۱۶۰ ـ قیمت : ۶ روپے

پتا : بہار اردو اکادمی پٹنہ ۸۰۰۰۰۱ (بھارت)

ابلاغ

مجلسِ ادارت: سیدہ حنا، نسرین سرورش، فریدہ نور، احمد پراچہ

صفحات: ۶۰ ـ قیمت : ۱۰ روپے

پتا احمد سلمان پبلی کیشنز یوسف آباد ـ دلہ زاک روڈ، پشاور (پاکستان)

نگار

مدیر : ڈاکٹر فرمان فتحپوری

صفحات: ۹۶ ـ قیمت : ۵ روپے

پتا : سی ۲۸ ـ بلاک ۱۳ گلشنِ اقبال، کراچی (پاکستان)

افکار

مدیر : صہبا لکھنوی

صفحات: ۸۴ ـ قیمت : ۶ روپے

پتا : مکتبہ افکار، رابسن روڈ کراچی (پاکستان)

آسمان

مدیر : راگ اتپالوی

صفحات: ۱۵ ـ قیمت : ۴ روپے

پتا : بی ـ الیف کیبرال روڈ ـ اسوامی ٹاؤن کراچی (پاکستان)

جنوری تا جولائی ۱۹۸۶ء کے رسائل کا موضوع وار اشاریہ —— آخری قسط

نئے خزانے

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری

ادبی و علمی شخصیات

آل احمد سرور

نارنگ، پروفیسر گوپی چند	پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق	ہماری زبان،	دہلی	۸/ مئی	۱۹۸۶ء	ص ۱
ناصر زیدی	حافظ مظہر الدین کی نعت گوئی	فیض الاسلام،	راولپنڈی	جولائی	〃	ص ۱۸
واجد قریشی	سجاد ظہیر کا نظریۂ فن	ہماری زبان،	دہلی	۱۵/ جون	〃	ص ۲
یونس حسنی، ڈاکٹر سیّد	روزنامہ دعوت دہلی کے (محمد) مسلم صاحب	تکبیر،	کراچی	۲۴/ جولائی	〃	ص ۳۶
	سیّد احمد عروج قادری	〃	〃	۳/ 〃	〃	ص ۷۴

تاریخی و سیاسی شخصیات

ابرار حسین، محمد	ہم لقب حکمرانانِ اسلام	العلم،	کراچی	اپریل	۱۹۸۶ء	ص ۱۸
الطاف علی بریلوی، سیّد	تاجدارِ دکن میر عثمان علی خاں کی تعلیمی خدمات	〃	〃	〃	〃	ص ۱۱
انتظام اللہ شہابی، مغل	مشاہیر اکبر آباد	انجمن،	〃	فروری	〃	ص ۱۱-۲۵
	〃	〃	〃	اپریل	〃	ص ۲۶-۳۳
باقر، ڈاکٹر محمد باقر	سردار عبدالرب نشتر	چٹان،	لاہور	۱۵/ جون	〃	ص ۱۸
رفعت جمال، ڈاکٹر	مولوی ذکاء اللہ دہلوی	العلم،	کراچی	جنوری	〃	ص ۶۰
	〃 〃 (۲)	〃	〃	اپریل	〃	ص ۵۰
رفیق افغان	ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی کی شہادت	تکبیر،	〃	۲۶/ جون	〃	ص ۱۹
شاہین، پروفیسر افتخار احمد	جی الانا	اظہار،	〃	اپریل	〃	ص ۵۱
طاہر شادانی	چودھری نذیر احمد خاں	سیارہ	لاہور	مئی	〃	ص ۲۳-۳۷

عبدالرؤف نوشہروی، پروفیسر	جابرین حیّان	العلم، کراچی جنوری	۱۹۸۶ء	ص ۳۸
عبداللہ ثانی	پرواز پرویز	طلوعِ اسلام، لاہور جولائی	؍؍	ص ۵۳
عنی شلش ڈاکٹر/عبدالرحمن الوعام (مترجم)	سید جمال الدین افغانی کی دو متضاد سوانح عمریاں	سیارہ، لاہور مئی	۱۹۸۶ء	ص ۱۴۵
قمر عباس، ڈاکٹر	مولانا محمد علی جوہر اور حادثۂ مسجد کانپور	المعارف، ؍؍ مارچ	؍؍	ص ۲۰۳
محمد اسلام	افکارِ پرویز کی صدی	طلوعِ اسلام، ؍؍ جولائی	؍؍	ص ۴۱
محمد اصغر	عظیم فلسفی ــ سقراط	محفل، ؍؍ جون	؍؍	ص ۱۴
محمد ریاض، ڈاکٹر	چودھری خلیق الزماں	آہنگ، کراچی ۱۷ مئی	؍؍	ص ۲۵
محمد یونس نگرامی ندوی، ڈاکٹر	سید صدیق حسن مرحوم	تعمیرِ حیات، لکھنؤ ۲۵ جون	؍؍	ص ۱۴
وفا راشدی، ڈاکٹر	شہاب الدین رحمت اللہ	العلم، کراچی اپریل	؍؍	ص ۶۷

مذہبی و دینی شخصیات

اختر راہی	مولانا محمد دین قندھاری ــ جن کے نام مولانا آزاد کے ترجمان القرآن کا انتساب ہے	صوتِ الاسلام، فیصل آباد جون	۱۹۸۶ء	ص ۵
اقبال احمد ندوی، حکیم خواجہ	بدلتی تعبیریں بدلتے نصب العین[1]	آئین، لاہور مئی	؍؍	ص ۹
ابوسلمان شاہجہان پوری، ڈاکٹر	حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی عظمت کے عناصر ترکیبی	الحق، اکوڑہ خٹک مئی	۱۹۸۶ء	ص ۴۱
احمد سعید، پروفیسر	حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ	بینات، کراچی جولائی	؍؍	ص ۴۹
جمیل شوکت، ڈاکٹر	الشیخ المراغی اور ان کی تفسیری خدمات	المعارف، لاہور مارچ	؍؍	ص ۲۵
سعید احمد مارہروی	بوستان اخبار	انجمن، کراچی جون	؍؍	ص
سعید الرحمن علوی، محمد	لاہور میں مبلغِ اسلام	المعارف، لاہور مارچ	؍؍	ص ۱۰۵
سعید الرحمن علوی	حضرت مجدد الف ثانی	حکمت قرآن، ؍؍ جولائی	؍؍	ص ۲۳
سلیمان	مولانا بحر العلوم مدارس میں	العلم، کراچی اپریل	؍؍	ص ۳۸
سیف، قاضی محمد اسلم	مولانا عبدالرزاق احمد پوری کی شہادت	ترجمان الحدیث، لاہور جون	؍؍	ص ۵۰
صلاح الدین، محمد	بابا غلام رسول ــ مدینہ منورہ کی ایک یادگار شخصیت	تکبیر، کراچی ۲۴ جولائی	۱۹۸۶ء	ص ۴۱
عبدالرشید عراقی	علامہ شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی اور ان کی خدمات	صحیفہ اہلِ حدیث، کراچی ۹ جون	۸۶	ص ۲۰

---

[1] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی پر تنقید

علیم ناصری	مولانا عبدالرشید صدیقی ملتانی	الاعتصام، لاہور ۲۷/جون	۱۹۸۶ء	ص ۳
محمد اسحاق	حسن البنا کی شخصیت	ترجمان القرآن، " جولائی	"	ص ۳۴
محمد اسحاق بھٹی	شاہ محمد اسحٰق دہلوی	المعارف، " مارچ	"	ص ۱۹۵
محمد اسرائیل فاروقی، پروفیسر حافظ	مولانا عبدالرزاق فاروقی	الاعتصام، " ۲۰/جون	"	ص ۱۵
محمد تقی عثمانی	وفات عارف باللہ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی	البلاغ، کراچی اپریل	"	
محمود احمد برکاتی، حکیم سید	علامہ فضل حق خیر آبادی (آخری قسط)	حکمت قرآن، لاہور جون	"	ص ۱۴

صحابۂ کرام وغیرہ

اشتیاق احمد لاری ندوی	سعد بن جبیر	الہام، بہاولپور ۲۸/جون	۱۹۸۶	ص ۳
سیّد، اے جی	حضرت امام حسینؓ	چٹان، لاہور ۱۶/اپریل	"	ص ۳۸
عابد حسین عسکری	مہدی موعودؑ	رضاکار، " یکم مئی	"	ص ۵
غلام سرور، کرنل	حضرت معاذ بن جبل	اظہار، کراچی اپریل	"	ص ۳۲
کرم الجلیلی (مترجم)	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ	صحیفہ اہل حدیث " ۲۶/مئی	"	ص ۱۶
	حضرت مقداد بن عمرو بن ثعلبہ	" " ۹/جون	"	ص ۱۸
	حضرت خبابؓ بن الارت بن جندلہ	" " –	"	ص ۱۸
گلزار احمد	دورِ نبوی کے مجاہدینِ اسلام	محفل، لاہور جون	"	ص ۲۷
محمد نعیم صدیقی، ڈاکٹر	حضرت امام موسیٰ بن جعفر	النخیر، ملتان جولائی	"	ص ۱۸
نصیر حسین نقوی، سیّد	حضرت ابو ذر غفاری	رضاکار، لاہور ۱۶/۲۴ جون	"	ص ۵
نصرت علی اثیر	حضرت عبداللہ بن مبارک	حکمت قرآن، " جولائی	"	ص ۴۹

صحافت

افضل حق قرشی	صوبہ سرحد کا پہلا اردو اخبار	المعارف، لاہور مارچ	۱۹۸۶ء	ص ۱۱۷
انور، محمد رمضان	ملتان کے قدیم اردو اخبارات	اردو نامہ، " جون	"	ص ۱۴
عبدالرفیق	وقائع نگاری اور کارٹون سازی (قدیم اردو صحافت کے حوالے سے)	اردو نامہ، لاہور جولائی	۱۹۸۶ء	ص ۱۳

علوم وفنون

شبیر احمد خاں غوری	علم منطق — ایک اجمالی جائزہ	المعارف، لاہور مارچ	۱۹۸۶ء	ص ۲۱۳
غلام نبی، حکیم (مترجم)	علوم فلکی	فیض الاسلام، راولپنڈی جولائی	"	ص ۲۳
معزالدین، ڈاکٹر	القانون فی الطب از بوعلی سینا	آہنگ، کراچی ۱۶/مئی	"	ص ۲۷

فنون لطیفہ

انٹونی برجس	خوش آہنگی کے اسرار	پیامی،	کراچی	جون	۱۹۸۶ء	ص ۱۲
ایانس زناکس	سائنس اور موسیقی	″	″	″	″	ص ۴
تارا کالوف، میخائیل امی	لوک ورثہ اور صوتی کمرہ	″	″	″	″	ص ۱۷
ڈومینیک جامو	غنائیہ سے پردۂ سیمیں تک	″	″	″	″	ص ۲۶
ڈینیئل وگلینی	جدید نغمہ — لاطینی امریکہ کا سرحدوں سے بالا نغمہ	″	″	″	″	ص ۹
رابرٹ ہانس وان گولیک	پرواز نغمہ — چینی روایت میں ربط اور گونج	″	″	″	″	ص ۱۸
لامینے کونتے	گرلی اوٹ — افریقی زندگی کا داستان گو اور گلوکار	″	″	″	″	ص ۲۱
مگل اینجل استربلا	موسیقی سب کے لیے	″	″	″	″	ص ۱۴
نیلس لغارت وانس	جدید صوتی منظر اور آلودگیٔ غوغا	″	″	″	″	ص ۳۱

کتابیات

ابوسلمان شاہجہان پوری	نئے خزانے (مارچ تا مئی ۱۹۸۶ء اور دیگر مہینوں کا موضوع وار اشاریہ)	قومی زبان،	کراچی	جون	۱۹۸۶ء	ص ۸۷
اسلم فرخی، ڈاکٹر	کتب خانۂ خاص کے نوادر — تاریخ چین	″	″	″	″	ص ۷
الطاف احمد اعظمی، حکیم	طب نبوی پر علامہ سیوطی کا مخطوطہ	الحق،	اکوڑہ خٹک	مئی	″	ص ۳۱
بشیر مہدی حسن	صاحب سیف الملوک کے آثار و افکار	المعارف،	لاہور	مارچ	″	ص ۱۰۳
جمیل احمد رضوی، سید	پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ذخیرہ مخطوطات	″	″	″	″	ص ۱۴۳
رضی حیدر، خواجہ	تحریک آزادی پر لکھی گئی کتابیں	العلم،	کراچی	جنوری	″	ص ۷۴
عبدالرشید عراقی، ملک	تصانیف مولانا ثناء اللہ امرتسری (۲)	الاعتصام،	لاہور	۲۵ جولائی	″	ص ۱۱
عطش درانی	سکرٹیریٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ راولپنڈی	اخبار اردو،	اسلام آباد	″	″	ص ۱
مجید بیدار، ڈاکٹر	طب پر دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی مطبوعات	اخبار اردو،	اسلام آباد	جون	۱۹۸۶ء	ص ۵

مذہبیات

سیرت نبوی ؐ

اخلاق حسین قاسمی، مولانا	عبدیت کاملہ — حضور ؐ کا منصب خاص	حکمت قرآن،	لاہور	جولائی	۱۹۸۶ء	ص ۲۲
زاہد، سید شبیر حسین شاہ	عقیدۂ ختم نبوت	مجاہد،	سرگودھا،	مئی		ص ۱۰
	″	″	″	جولائی	″	ص ۱۷

عاشق مصطفیٰ	نبوی کفالتیں	نخلستانِ ادب، بہاولپور	۱۹۸۵ء	ص ۱۱
عبدالجبار شیخ، محمد	معلمِ اعظمؐ کا حکیمانہ اسلوب	محفل، لاہور	جون ۱۹۸۶ء	ص ۳۳
عبدالقادر جیلانی	رسول اللہ اور آپؐ کی تعلیمات کے بارے میں مستشرقین کا اندازِ فکر	حکمت قرآن، لاہور	جولائی ۱۹۸۶ء	ص ۵۴
محمد اکرم، شیخ	ختم نبوت کی ضرورت و مصلحت	الاعتصام ″	۲۷ جون ″	ص ۱۳
″	″ ″ (۲)	″ ″	۴ جولائی ″	ص ۱۰
″	″ (۳)	″ ″	۱۱ ″ ″	ص ۱۰
″	″ (آخری قسط)	″ ″	۱۸ ″ ″	ص ۱۴

قرآنیات

اسرار احمد، ڈاکٹر	"حظِ عظیم" سورہ حٰم السجدہ کی آیات کی روشنی میں	میثاق، لاہور	جون ۱۹۸۶ء	ص ۳۳
	تعمیر سیرت کی اساسات — سورہ مومنون اور سورہ معارج کی روشنی میں	میثاق، لاہور	جولائی ۱۹۸۶ء	ص ۲۱
اسرار احمد، ڈاکٹر	درسِ قرآن: سورہ محمد (۲)	حکمت قرآن، ″	″ ″	ص ۹
تقی عثمانی، مولانا	تاریخ حفاظتِ قرآن	محفل، ″	جون ″	ص ۱۳
ثریا عندلیب	قرآنی نظامِ عدل	طلوعِ اسلام، ″	″ ″	ص ۲
سعید احمد، پروفیسر مولانا	قرآنِ کریم کی پہلی وحی	صوتِ الاسلام، فیصل آباد	″ ″	ص ۱۱
سمیع الحق، مولانا	قرآن سیمینار ڈھاکہ ۱۹۶۸ء کا ایک تاریخی سفر	″ ″	″ ″	ص ۶۷
شمس الحق افغانی، مولانا سید	دورِ حاضر کے مسائل اور قرآن مجید	″ ″	″ ″	ص ۴۲
عبدالماجد دریابادی، مولانا	قرآنِ کریم کے انگریزی تراجم کا جائزہ	″	″	ص ۵۹
عزیز زبیدی، مولانا	تفسیر سورۃ البقرہ	الاعتصام، لاہور	۶ ″ ″	ص ۴
″	″ (۳۹)	″ ″	۲۰ ″ ″	ص ۵
″	″ (۴۱)	″	۴ جولائی ″	ص ۲
″	″ (۴۳)	″	۱۸ جولائی ″	ص ۵
عمر احمد عثمانی	تفسیر سورہ والطور	فیض الاسلام، راولپنڈی	جون ″	ص ۹
	″	″	جولائی ″	ص ۹
فیوض الرحمٰن، ڈاکٹر	جمع و تدوین قرآنِ کریم	صوت الاسلام، فیصل آباد	جون ″	ص ۱۹

کلیم اختر	کشمیر میں قرآن مجید کا قدیم نسخہ	المعارف، لاہور مارچ ۱۹۸۶ء	ص ۴۵
مجاہد الحسینی	قرآن مجید	صوت الاسلام، فیصل آباد جون 〃	ص ۲۵
مجاہد الحسینی	قرآن کریم تسخیر کائنات	〃 〃 〃 〃	ص ۸۳
محمد اجمل، مولانا	عظمت قرآن کریم	〃 〃 〃 〃	ص ۶۵
محمد اسلام، حافظ	دور صدیق اکبر میں تدوین قرآن	〃 〃 〃 〃	ص ۲۷
محمد حسین، میر	سورہ ہائے الفلق والناس	ترجمان القرآن، لاہور جولائی 〃	ص ۴۷
محمد حنیف تسیب	قرآن حکیم اور علامہ اقبال	صوت الاسلام، فیصل آباد جون 〃	ص ۵۱
	خطبہ حجۃ الوداع اور مقام حدیث	طلوع اسلام، لاہور 〃 〃	ص ۳۲

مسائل ومباحث

آزاد، مولانا اسماعیل	مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ	پہچان، کراچی جون ۱۹۸۶ء	ص ۱۸
ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید	حیات ملی میں خواص امت کا مقام	الفجر، فیصل آباد ۲۲ جون 〃	ص ۱۱
اسرار احمد، ڈاکٹر	اسلامی انقلاب، مراحل، مدارج اور لوازم	میثاق، لاہور 〃 〃	ص ۳۳
	〃 〃 〃 〃 (۳)	〃 〃 جولائی 〃	ص ۷۵
اطہر، ڈاکٹر ظہور احمد	اسلامی انقلاب	رضاکار، 〃 ۲۴ر اپریل 〃	ص ۳
خادم حسین لغاری، پروفیسر	نظریۂ ولایت، فقیہہ کی عملی صورت (۱)	〃 〃 (اشاعت خصوصی) ۱۹۸۶ء	ص
	〃 〃 (۲)	〃 〃 ۱۷/۲۴ جون ۱۹۸۶ء	ص ۳
سعید احمد اکبر آبادی، مولانا	دور جدید میں اسلامی قانون فقہ	صدائے اسلام، پشاور 〃 〃	ص ۶/۸
شہاب الدین ندوی	طلاق ثلاثہ پر ایک حقیقی نظر	الحق، اکوڑہ خٹک 〃 〃	ص ۷
عبدالغفار حسن، مولانا	حضرت ماعز اور روایات حد رجم	محدث، لاہور اپریل 〃	ص ۴۶
عبدالمنان، مولانا	کیا اجتہادی وقیاسی مسائل شریعت ہیں؟	ترجمان الحدیث، 〃 جون 〃	ص ۴۲
عبدالواحد، مولوی	اہل حدیث اور ان کا تاریخی استحکام (آخری قسط)	الاسلام 〃 ۶ر 〃 〃	ص ۷
عبدالواحد، مولانا	تقلید قرآن کے آئینے میں	〃، 〃 جولائی 〃	ص ۷
محمد سلیم، پروفیسر سید	کیا وجود باری تعالیٰ کا ثبوت ممکن ہے؟	ترجمان القرآن، 〃 〃 〃	ص ۵۰
محمد تقی عثمانی	شفعہ کے رائج الوقت قوانین	البلاغ، کراچی اپریل 〃	ص ۴۳
محمد متین خالد	مباہلہ	مجاہد، سرگودھا جولائی 〃	ص ۲۳
نیاز احمد خاں	اسلام میں انسانی حقوق	البلاغ، کراچی جون 〃	ص ۱۹

Regd. M. No. 270 Phone: 724023

Monthly **QAUMI ZABAN** Karachi

انجمن کی مجوّزہ عمارت کا نقشہ

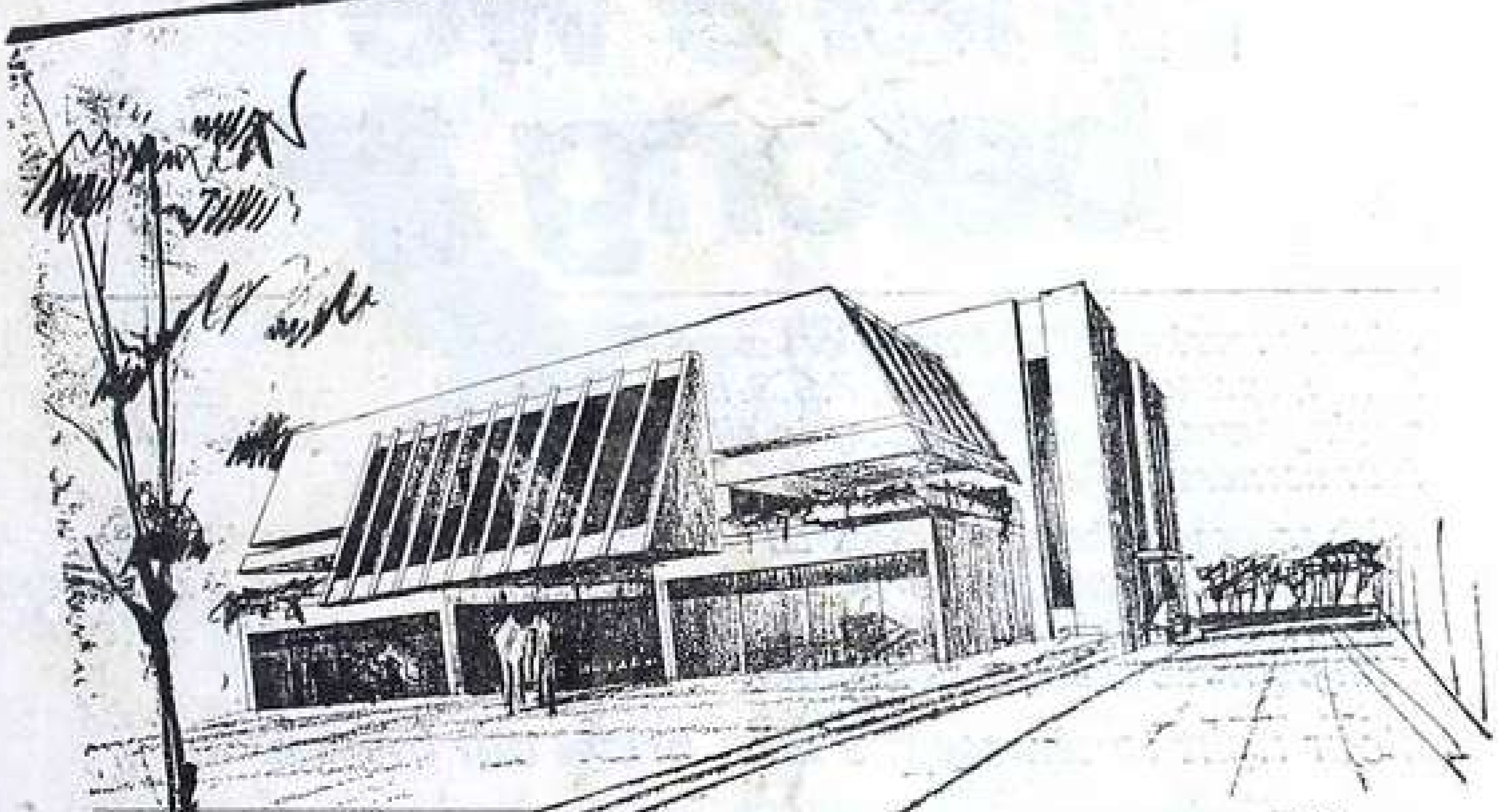

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر:- ادیب سہیل کلیم الحسن نقوی کے زیر اہتمام انجمن پریس کراچی میں چھپ کر
انجمن ترقی اردو (پاکستان) - بابائے اردو روڈ - کراچی سے شائع ہوا۔